الناظر [illegible] اسلامی میگزین

اقبال نمبر

شبیہ اقبال مرحوم

مشرق و مغرب اسیرِ حسرت و اندوہ ہے
ملتِ اسلام میں اقبال کا ماتم ہے آج

۱۳۵۷ھ

مطبوعہ سلطان المطابع برقی پریس لکھنؤ

AUG 1971
IQBAL ACADEMY KARACHI [redacted]
IQBAL ACADEMY PAKISTAN LIBRARY. Acc. No. 1026 LAHORE.
LIBRARY 1026 ACADEMY, KARACHI

Teaching Staff, Amiruddaula Islamia High School, Lucknow.

1.	Mr. Mohammad Abdul Hai, M. A., LT., ...	*Head Master.*
2.	B. Indu Bhushan Gupta, B. Sc., A.T.C.	*Science Master.*
3.	Mr. Syed Jawad Husain, B. A., L.T., ...	*Geography Teacher.*
4.	Mr. Syed Ahmad Husain, B. A. Honours (Maths:) L.T., Specialist (Maths.)	*Maths: Teacher.*
5.	Mr. Syed Zawwar Ali, B. A. (Hons.) M. A., (English) L.T.,	*English Teacher.*
6.	Mr. Syed Mohammad Tahir, B. Sc., LT., Specialist (Science.)	*Science Master.*
7.	Mr. Qaisurul Islam, M. A., (Politics) B.T., Specialist (English)	*History Teacher.*
8.	Mr. Shaukat Ali, M. A., (Geography) LT., Specialist (Geography.)	*Geography Teacher.*
9.	Mr. Murtaza Husain, M. A., (Persian) A.T.C. ...	*Persian Teacher.*
10.	Mr. Iradat Hussain, Kidwai, B Sc., B. T., Specialist (Maths:)	*Maths: Teacher.*
11.	Mr. Mohammad Nasir Husain Khan, Diploma holder, Roorkie Engineering College.	*Drawing Master.*
12.	Mr. Irtiza Karim, Matric, A.T.C.	*Librarian.*
13.	M. Ashraf Husain, Fazil (Arabic)	*Arabic Teacher.*
14.	M. Mubarak Husain, Munshi Alim, (Peraian) ...	*Persian Teacher.*
15.	M. Mohammad Hasan Khan (Arshi) Dabiri; Kamil; M. S. H. P.	*Urdu Teacher.*
16.	Mr. Anwar Ahmad, M. A., (Previous C. T. ...	*History Teacher.*
17.	Mr. Mahmud Ahmad, Matric; D.T.T.C.	*Drawing Master.*
18.	Mr. Ishtiaq Husain, I. Sc., C.T.	*El: Sc.; & Nature Study Teacher.*
19.	Mr. Zamir Husain, I. Sc., C.T.	*Maths: & El: Sc.; Teacher.*
20.	Mr. Nasir Husain Khayal, I. A., C.T.	*El: Sc: & Nature Study Teacher.*
21.	Pt. Shiva Nand Sharma, Maddhima, ...	*Hindi Teacher.*
22.	Mr. Yousuf Ali Khan, I. A., C. T.	*Geography Teacher.*
23.	Mr. Qasim Ali, Munshi, V.T.C.	*Urdu Teacher.*
24.	Mr. Izharuddin, I. Sc., C.T., ...	*Maths: & El: Sc.;*
25.	Mr. Shafiq Ahmad, I.A., C.T.	*English Teacher.*
26.	M. Shah Nur Khan, Late Military Dafadar, Trained in Physical Training.	*Physical Instructor.*

[redacted]
LIBRARY
Book No.
ACADEMY, KA

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ؕ

اَمیرُ الدولہ اِسلامیہ ہائی اِسکول میگزین

مدیرِ شعبۂ اُردو۔ عرشی　　　مدیرِ معاون۔ شرافت علی صہبا

جلد ۲　　　اکتوبر ۱۹۳۸ء

سرِ آغاز

گزارشِ احوالِ واقعی

الحمد للہ کہ اس نمبر سے میگزین کی دوسری جلد کا آغاز ہو رہا ہے قلتِ سرمایہ کے باوجود سالِ گذشتہ کے ابتدائی نمبر جس آب و تاب کے ساتھ نکل کر ادبی معیار کو برقرار رکھنے میں کامیاب ثابت ہوئے ہیں وہ اسکول کی ادبی انجمن کا ایک عدیم المثال مظاہرہ ہے جس کے باعث نہ صرف ہمارے حوصلوں میں بلندی پیدا ہو گئی ہے بلکہ ہم نے تہیہ کر لیا ہے کہ اس وادیٔ پرخار میں جو کچھ گزرے اُسے نہایت خندہ پیشانی سے برداشت کیا جائے اور جن علمی و اصلاحی مقاصد کے تحت میگزین کو جاری کیا گیا ہے انکے حصول کی جد و جہد کو حسبِ حال قائم رکھا جائے اور آئندہ بھی اُن وسائل کو اختیار کیا جائے جو کسی رسالہ کو منتہائے کمال پر پہونچانے کا سبب ہوتے ہیں۔ زیرِ نظر مخصوص نمبر اسی عزمِ راسخ کا نتیجہ ہے۔ اس کے نکالنے میں ہمیں گوناگوں مشکلات و موانع کا مقابلہ کرنا پڑا مگر تائیدِ ایزدی نے ہماری تمام دشواریوں کو کالعدم کر کے اسکا موقع دیا کہ ہم اپنے ارادوں کو عملی جامہ پہنا سکیں۔ ہم کو اپنی کوتاہیوں کا اعتراف ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ اپنے نصب العین خلوص اور جانفشانی پر اعتماد ہے۔ ہر کام میں ابتدا میں دشواریاں ہوتی ہیں اور بعض ناگزیر خامیاں بھی لیکن ان سب پر فوق، کام کرنے والوں کے خلوصِ نیت، غیر معمولی شغف اور نشاطِ کار کو سمجھا جاتا ہے۔ جہاں تک اِن امور کا تعلق ہے۔ ہمارے بہی خواہوں کو یقین رکھنا چاہئے کہ ہم اپنی بے بضاعتی کے باوجود حصولِ مقصد کے لئے بیش از بیش ایثار و قربانی کرنے میں دریغ نہ کرینگے لیکن ہم اسکے ساتھ اپنے مخصوص احباب اور ناظرین سے اسکے بھی متوقع ہیں کہ وہ اگر اس پرچہ کو زیادہ سے زیادہ مفید علمی پرچہ بنانا چاہتے ہیں تو اُن کو بجائے نکتہ چینی اور دُور از کار تنقید و تنقیص کے عملی ہمدردی کا بھی ثبوت دینا چاہئے۔ اِس نمبر کو کامیاب بنانے کے لئے ادارہ کی جانب سے کتنی سعی کی گئی ہے اسکے بیان کی چنداں ضرورت نہیں۔ میگزین کی صوری و معنوی خوبیاں خود اسکی شاہد ہیں کہ ؎

بہارِ عارضش جنبش دلِ جاں تازہ میدارد　　　برنگِ اصحابِ صورت را، بہ بو اربابِ معنی را

اقبال نمبر ہندوستان کا شاعرِ اعظم اپنی موت سے چند منٹ پیشتر۔ اشعارِ مندرجہ صفحہ ۶ کہکر ۲۱ اپریل ۳۸ء کو ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گیا۔ اس جانگداز حادثہ سے نہ صرف ہندوستان بلکہ ساری دنیا میں کہرام مچ گیا اقصائے عالم کے گوشہ گوشہ میں

صفِ ماتم بچھ گئی۔ زمانے کے ساتھ ہم بھی اشکبار ہوئے۔ تعزیتی جلسہ کیا، مرحوم کے پسماندگان کے نام تعزیت و ہمدردی کے تار روانہ کئے گ[redacted] باتیں رسمی اور وقتی تھیں اس لئے ادارہ نے یہ طے کیا کہ مرحوم کے سوانح حیات اور علمی و ادبی خدمات سے طلبا کو روشناس [redacted]نے کے لئے میگزین کا ایک خاص نمبر اقبال کے نام سے نکالا جائے۔ چنانچہ اس نمبر میں بیشتر مقالے اسی غرض و غایت کو مدِ نظر رکھکر شائع کئے گئے ہیں۔ صرف تفننِ طبع کے لئے معدودے چند ایسے مضامین کو بھی جگہ دیگئی ہے جو خاص تعلیمی یا اصلاحی ہیں۔

اقبال کی موت کوئی معمولی واقعہ نہیں ہے۔ کسی قوم میں صدیوں کے بعد اس رتبے کا شاعر پیدا ہوتا ہے۔ اقبال یقیناً مشرق کا سب سے بڑا شاعر تھا جس کے بعد شعر و سخن، علم و فضل اور فلسفہ و حکمت کی مجلسیں بے رونق ہو گئی ہیں۔ اقبال حیاتِ انسانی کے وہ رموز بیان کرکے رخصت ہوا جس سے قوم اپنے اندر بیداری محسوس کرنے لگی ہے اور اُس کو ایک ایسا راستہ نظر آنے لگا ہے جس پر گامزن ہونے میں وہ اپنی نجات تصور کرتی ہے اگرچہ اسکی زبان ہمیشہ کے لئے بند ہوگئی مگر اسکے جانفزا نغمے ابد تک فضا میں گونجتے رہیں گے اور خودی کی وہ تعلیم جس کے لئے اس نے اپنی دنیائے تخیل کو وقف کر دیا تھا کائنات کے ذرّے ذرّے سے خراجِ تحسین و آفریں حاصل کرتی رہیگی اس حکیمِ مشرق کی موت سے جو جگہ خالی ہوئی ہے اُسکے پُر ہونے کی صدیوں تک توقع کرنا ایک واہمہ ہے۔ فطرتِ انسانی کے سب سے بڑے نبّاض کے چلے جانے سے ہر ایک روح افسردہ ہو چکی ہے مگر اس کے وہ روح پرور نغمے جو فضائے بسیط پر مسلط ہیں ایک نئے مستقبل کا مژدہ سناتے ہیں وہ خودی کی تعلیم دیتے وقت انسان کو یوں خوشخبری دیتا ہے ؎

زانجم تا بہ انجم صد جہاں بود — خرد ہر جا کہ پر زد آسماں بود
ولیکن چوں بخود نگریستم من — کرانِ بیکراں در من نہاں بود

خودی کے متعلق جو اسرارِ حیات اس نے بے نقاب کئے ہیں۔ اس پر مغرب اپنی انتہائی تہذیب کے باوجود انگشت بدنداں ہے اقبال کی آواز نے مشرق کی آنکھیں کھول دیں۔ اس نے مشرق کی روح کو پہچانا اور اپنے بلند ترین تخیل کو ہمیشہ مشرقیت کے لباس میں پیش کیا مغرب کا قلیل ترین اثر بھی اپنے خیالات میں ظاہر نہیں ہونے دیا۔ اور یہی اس کے مشرق کے **شاعرِ اعظم** ہونے کی روشن دلیل ہے۔

امتحان ہائی اسکول کے نتائج

خدا کے فضل و کرم سے اس سال بھی ہمارے اسکول کے طلبا امتحان ہائی اسکول میں ۸۲½ فیصدی کامیاب ہوئے اس طرح صوبے کے تمام اسلامیہ اسکولوں اور مقامی ہائی اسکولوں میں باعتبار نتائج ہمارے اسکول کا نمبر تیسرا رہا۔ مقامی اسکولوں کی تفصیل حسب ذیل ہے:۔

۱- کالون تعلقہ دار انٹر کالج	۹۰٫۹ فیصدی	۶- امین آباد ہائی اسکول	۷۳٫۴ فیصدی
۲- جوبلی انٹر کالج	۸۵٫۹ ″	۷- کانیہ کبج انٹر کالج	۸۳ ″
۳- امیر الدولہ اسلامیہ ہائی اسکول	۸۲٫۵ ″	۸- کوئنس ہائی اسکول	۶۴٫۳ ″
۴- ڈی- اے- وی- ہائی اسکول	۸۰٫۷ ″	۹- کالیچرن ہائی اسکول	۶۳٫۲ ″
۵- گردھاری ہائی اسکول	۷۷٫۱ ″	۱۰- حسین آباد ہائی اسکول	۵۲٫۱ ″

۱۱- لکھنؤ کرسچین کالج	۴۱ر۲۴ فیصدی	۱۴- سینٹ جوزف ہائی اسکول	۳۸ر۰۸ فیصدی
۱۲- لکھنؤ ہائی اسکول	۴۰ر۲ ″	۱۵- شیعہ انٹر کالج	۳۴ر۳ ″
۱۳- ہریشچندر ہائی اسکول	۴۰ ″		

LIBRARY
Book No. (026)

ہم اس سلسلہ میں ادارہ کی جانب سے اپنے اسکول کے کامیاب طلبا کو دلی مبارکباد پیش کرتے ہیں

کیا آپ مسلمان بچوں کی تعلیم کو ضروری سمجھتے ہیں؟

اگر اس کا جواب اثبات میں ہے تو پھر کیوں آپکو ان صدہا بچوں کی حالتِ زار پر رحم نہیں آتا جو ہر سال اپنے اس قومی اسکول میں داخلہ سے صرف اس لئے محروم رہتے ہیں کہ اسکول کی کہنہ عمارت کے تنگ کمروں میں زیادہ لڑکوں کی نشست کا انتظام نہیں ہو سکتا فی زمانہ کے لحاظ سے سائنس کی تعلیم نہایت ضروری ہے مگر جگہ کی قلت سے اکثر طلبا کو مجبوراً اس مضمون کو چھوڑنا پڑتا ہے صنعت و حرفت اور دستکاری کی تعلیم کا انتظام بھی اس وقت تک نہیں ہو سکتا جبتک اسکول کی عمارت میں چند جدید کمروں کا اضافہ نہ ہو. کیا اپنے شاندار نتائج، قابل اسٹاف اور بہترین تعلیم کی بنا، پر یہ اسکول آپکی فیاضی اور لطف کریمانہ کا مستحق نہیں۔ ہمیں امید ہے کہ اس مرتبہ ہماری اس عرضداشت پر قوم کے رؤسا و عمائدین ضرور توجہ مبذول فرمائیں گے۔ اور جلد سے جلد اسکول کی توسیع عمارت کی صورت میں اپنے جود و سخا کی ایک غیر فانی یادگار قائم کر دیں گے۔

آنانکہ خاک را بنظر کیمیا کنند
آیا بود کہ گوشۂ چشمے بما کنند

انجمن اربابِ ادب کی ارتقائی رفتار

سنہ ۱۹۲۰ء میں جناب عبدالوحید صاحب ہیڈ ماسٹر اسکول ہذا کی تحریک پر سب سے پہلا مشاعرہ اسکول میں منعقد ہوا. دوسرے سال محمد سعید خاں صاحب ہیڈ ماسٹر نے مشاعرہ کے ساتھ مجلس مناظرہ اور دارالمطالعہ کو بھی شامل کر کے اس سوسائٹی کو انجمن اربابِ ادب کے نام سے موسوم کر دیا اس کا ایک دستور العمل بنایا گیا جس کے مطابق ہیڈ ماسٹر محمد سعید خاں اس ادبی انجمن کے سب سے پہلے صدر ہوئے اور بقیہ شعبوں کے لئے اساتذہ میں سے نائب صدر اور طلبا میں سے سکریٹری و جوائنٹ سکریٹری مقرر ہوئے دو سال گذر جانے پر جب کسی قدر سرمایہ جمع ہو گیا تو سنہ ۱۹۲۲ء میں اسی دستور العمل کو معمولی ترمیم کے ساتھ اردو میں طبع کرا لیا گیا جس پر سنہ ۱۹۳۲ء تک عملدر آمد رہا مگر اس زمانہ تک انجمن کی مالی حالت حد درجہ سقیم تھی اسکول کے سالانہ مشاعروں کے علاوہ مجلس مباحثہ و مناظرہ کا دائرہ عمل صرف اسکول تک محدود رہا سنہ ۱۹۳۱ء میں سابق ہیڈ ماسٹر کے بیجا تصرف سے انجمن کو بہت نقصان پہونچا آخرکار ارکان انجمن کے احتجاج پر ایک نیا دستور العمل مرتب ہوا جس میں ہیڈ ماسٹر اسکول کو سرپرست انجمن قرار دیا گیا اور صدر اور نائب صدر کے عہدے اساتذہ کے لئے مخصوص کر دیے گئے سنہ ۱۹۳۴ء سے موجودہ ہیڈ ماسٹر صاحب کا نیا دور شروع ہوا جو انجمن کے لئے حیات تازہ لایا چنانچہ سنہ مذکور سے اب تک جن اہم اور مفید تحریکات کا اضافہ ہوا ان سے انجمن کی گذشتہ تاریخ بالکل خالی ہے۔ اس کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

(۱) سنہ ۱۹۳۵ء میں سالانہ انگریزی پراونشیل مناظرہ کی ابتدا ہوئی۔

(۲) ۱۹۳۶ء میں سالانہ اُردو پراونشیل مناظرہ کی ابتدا ہوئی۔
(۳) ۱۹۳۶ء میں زیر اہتمام انجمن مشاہیر کے تقریری شعبہ کا آغاز ہوا
(۴) ۱۹۳۶ء میں " " اسکول میگزین کا اجرا ہوا
(۵) " " بیرونجات کے تقریری مقابلوں کے شرکت کے لئے طلبا کو انجمن کے خرچ سے بھیجنا طے پایا۔
(۶) ۱۹۳۸ء میں مضمون نگاری اور برجستہ تقریری مقابلے کا شعبہ قائم ہوا

اس میں شک نہیں کہ انجمن کی یہ پنج سالہ قابل رشک ترقی موجودہ ارکان انجمن کی رہین منت ہے جو درمے قدمے، سخنے غیر معمولی انہاک کے ساتھ انجمن کی کامیابی کے لئے ہمہ وقت سرگرم عمل رہتے ہیں ۔

انجمن کا ششماہی مشاعرہ

عید پارٹی کے دن اسکول ہال میں منعقد ہوگا۔ مصرعۂ طرح مندرجۂ ذیل ہے:-
ع - خبر نہیں کہ خودی کیا ہے بیخودی کیا ہے۔ قافیہ زندگی۔ ردیف - کیا ہے
عنوانات نظم:- (ا) دوست (ب) کسان (ج) مزدور (د) عید پارٹی

میگزین کے مضامین

اس نمبر کا ہر مضمون اپنی نوعیت کے لحاظ سے نہایت سبق آموز ہے خصوصاً علامہ اقبال پر جس قدر مقالے لکھے گئے ہیں انکے ادبی محاسن سے لطف اندوز ہونے کے لئے ایک عمیق مطالعہ کی ضرورت ہے مثنوی "پس چہ باید کرد اے اقوام شرق" کا ملخص جس دلنشین اور سلیس پیرائے میں قلمبند کیا گیا ہے اس کو انشاپردازی کا ایک اعجاز سمجھنا چاہیئے جس طرح کامل مصور کی قلمکاری تصویر کی مختلف الالوان شوخیوں میں لاتعداد دل آویزیاں پیدا کردیتی ہے ۔ اسی طرح اس مضمون میں بلاغت کی سحر آفرینیوں اور نادر تشبیہات اور رنگین استعارات کی آمیزش سے ایک شعریت پیدا ہوگئی ہے جو قلب پر خاص اثر کرتی ہے معلوم ہوتا ہے کہ فاضل مضمون نگار کو باریک سے باریک نکات اور رموز کو لطافت وفصاحت کے ساتھ ادا کرنے میں علی وجہہ الاتم کمال حاصل ہے۔ ماتم اقبال کی فارسی نظم اسی ادیب کامل کی قادر الکلامی کا نتیجہ ہے جس کی ادبی ومعنوی خوبیاں داد سے مستغنی ہیں ۔

(ایڈیٹر)

اعتذار

:- ہمیں بیحد افسوس ہے کہ ہم بہت سے مضامین کو عدم گنجائش کے سبب شائع نہ کر سکے ۔ اس نمبر میں علاوہ ان مضامین کے جو اقبال سے متعلق ہیں صرف ایسے ہی مضامین کو جگہ دی گئی ہے جن کو کسی نہ کسی حیثیت سے انتخابی تفوق حاصل ہے یا جن کا طلبا کے اخلاق وتعلیم سے خصوصیت سے واسطہ ہے بقیہ غیر مطبوعہ مضامین کو جو ہمارے انتخاب میں آچکے ہیں سالنامہ کے لئے محفوظ کرلیا گیا ہے۔ مضمون نگاران کو اطمینان رکھنا چاہیے ۔

ایک ضروری تصحیح

نظم صفحہ ۵۳ کے شعر اول کے پہلے مصرعہ میں قارئین خاموش کے بجائے "مانوس" بنالیں ۔

(ادارہ)

LIBRARY IQBAL ACADEMY
1026

یادِ اقبال

ادیب باکمال شاعر شیریں مقال عالیجناب سید نواب علی صاحب بالقابہ ایم اے منیجر اسکول ہذا و سابق وزیر تعلیمات جوناگڈھ

بلند پایہ سخنور حکیم ہند اقبال   چو بانگ "ارجعی" بشنید گشت محو جمال
چہ گفت! گفت کہ از مرگ من نمی ترسم   چو مسلم، متبسم روم بہ بزم وصال
خدا رسیدہ، خودی را است کاشفِ اسرار   رموز بیخودیش "انظروا الی ما قال"
چہ جرات است کہ از حق شکایت است او را   جواب شکوہ او داد ایزد متعال
شکست ضرب کلیمش فرنگ را نیرنگ   پیام مشرق او زد زمان اوج کمال
فگند غلغلہ جاوید نامہ اش بہ فلک   چو رفت زمزمہ خوان تا سرادق اجلال
سر آمدہ شب دیجور گفتہ بہ ملت   ز نو نمودہ چو از بال جبرئیل ہلال
چہ ہست بانگِ درائے الست شد لاریب   کلام او شدہ تا روز حشر حسن مقال
حیاتِ او سبق آموز ملک و ملت را   چراغ بیت عتیق است و دیر را تمثال
دماغ مغربی و قلب مشرقی او را   بشرق و غرب ضیا پاش بود مہر مثال
نمود سادہ دلاں را نگاہ حق بینش   وطن پرستی مغرب چو فتنۂ دجال
درست ہست کہ "حب الوطن من الایمان"   گر پرستش او جان خلق را ست وبال
چو پیر روم بیامیخت فلسفہ با دین   ز خاک سجدہ برافروخت آتش سیال
ببیں بہ دورۂ "ماشین" چوں حدی خوان است   جنون نوازی او عقل را کشید عقال
حسن ز بصرہ بلال رضؓ از حبش صہیب رضؓ ز روم   بیا ببیں کہ چساں بود پور ہند اقبال
نہ شاعرے کہ بہر وادی است سرگرداں   نہ شاعرے کہ از اقوال او جدا افعال
ترانہ اش ہمہ عشق و سرود او ہمہ درد   ز نو نگفت کہن داستان ہجر و وصال
فدائے ملت و پیک رجا و خضر طریق   سوار اشہب دوراں وحید عصر اقبال

"فرشتہ صید و پیمبر شکار و یزداں گیر"
بہ یاد او دل نواب مست بادۂ حال

کلماتِ الوداعی

علامہ اقبال علیہ الرحمہ نے اپنے آخری لمحاتِ زندگی میں مندرجۂ ذیل الوداعی شعر کہے تھے انکو پڑھکر دل اس قدر متاثر ہوا کر چند نالہائے پریشاں اسی بحر میں فی الفور نظم ہو گئے جن کو اپنا ترجمانِ غم سمجھ کر شائع کر رہا ہوں اور بس۔ (مدیر)

سرودِ رفتہ باز آید کہ ناید — نسیمے از حجاز آید کہ ناید
سرآمد روزگارِ ایں فقیرے — دگر دانائے راز آید کہ ناید

(علامہ اقبال مرحوم)

بہ گلشن رنگِ ناز آید کہ ناید — ہزارے نے نواز آید کہ ناید
بگوشِ خلق از سازِ شکستہ! — نوائے دل گداز آید کہ ناید
دلِ افسردہ را پر سوز سازد — چنیں آواز ساز آید کہ ناید
بسوزِ عشق در جلوہ گہہ ناز — نوا سنجِ نیاز آید کہ ناید
بصد آداب و اخلاص و تشکر — لبِ شکوہ طراز آید کہ ناید
شود بانگِ درا آہِ دلِ او — چنیں دیوانہ باز آید کہ ناید
بہ رندی قبلۂ زہاد باشد — دگر آں پاکباز آید کہ ناید
ادیب و فلسفی و مصلحِ قوم — حکیم و چارہ ساز آید کہ ناید
دریں بزمِ ادب ہمتائے اقبال — کسے آگاہ راز آید کہ ناید

دگر عرشی دریں بتخانۂ ہند
مغنیِ حجاز آید کہ ناید

پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق؟

(عالیجناب سید نواب علی صاحب ایم اے ہیڈ ماسٹر سکول ہذا و سابق وزیر تعلیمات جوناگڈھ)

ڈاکٹر اقبال مرحوم نے وفات سے دو سال پیشتر پانسو اشعار کی ایک چھوٹی سی مثنوی موسوم بہ "پس چہ باید کرد اے اقوام شرق" مولانائے روم کے شہرۂ آفاق مثنوی کی پیروی میں لکھی۔ اس میں وہی جوش وہی سوز اور وہی زور تخیل ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا "زبان پہلوی کے قرآن" کا سورۂ اخلاص ہے۔

پہلے ایک قطعہ لکھا ہے جس میں کتاب کے پڑھنے والوں سے یوں خطاب ہے

سپاہ تازہ بر انگیزم از ولایت عشق — کہ در حرم خطرے از بغاوت خرد است

زمانہ ہیچ نداند حقیقت او را — جنوں قباست کہ موزوں بقامت خرد است

اقبال کو مغرب زدگی کا تلخ تجربہ تھا۔ وہ خوب جانتے تھے کہ مستشرقین یورپ نے ہمارے نوجوان "دکاترہ" میں کس طرح سے علم الملکوتی ذہنیت پیدا کر دی ہے۔ اس ذہنیت کے نشہ میں وہ اسلامیات کو تقویم پارینہ سمجھنے لگے ہیں اور علوم و فنون جدیدہ کا کلمہ پڑھتے ہیں لیکن حقیقت میں یہ خرد کے باغیانہ خیالات ہیں جن کی مدافعت کے لئے حکیم قوم عشق کے ولایت سے ایک نئی فوج لاتا ہے جس میں وہ "جنون" سرگرم عمل ہے جس نے مسٹر محمد علی آکسن کو مولانا محمد علی جوہر بنا کر زندہ جاوید کر دیا اور جس نے خود ڈاکٹر سر محمد اقبال کو علامہ اقبال رحمتہ اللہ علیہ بنا دیا۔

اب مثنوی کا آغاز ایک تمہید سے ہوتا ہے جس میں "پیر رومی مرشد روشن ضمیر" کی روح پرفتوح یوں خطاب کرتی ہے۔ اقبال تو فرنگ کی آتش نمرود میں بیٹھ چکا ہے اب خلیل اللہ کی طرح اٹھ اور جہل و ظلم کے جتنے بت ہوں ان سب کو "جنون ذوفنون" کے جوش میں توڑ ڈال اس لئے کہ تیرے زمانہ میں رمز جان سے آگاہی نہیں رہی اور غیر اللہ کی محبت کو دین کہنے لگے ہیں اب تو اہل حق کو دین و سیاست کی حکمت سمجھا

مولانائے روم نے دفتر اول میں نالہ نے کے بعد شمس تبریز کو یاد کیا ہے اقبال شمس فلک سے یوں مخاطب ہوتے ہیں

خطاب بہ آفتاب اے امیر خاور تیری روشنی اور گرمی سے کائنات کی ہر شے کو فیض پہنچ رہا ہے میرے دل کو بھی روشن کر دے تاکہ میں احرار شرق کے سینہ کو چمکا دوں اور ان کے افکار کو بند فرنگ سے آزاد کر دوں اس لئے کہ جب کسی قوم کے خیالات خراب ہو جاتے ہیں تو ان کی کھری چاندی بھی کھوٹی ہو جاتی ہے راستی کجی نظر آتی ہے اور قلب سلیم پر موت کی غشی چھا جاتی ہے۔ ایسی حالت میں سب سے پہلے تطہیر فکر چاہیئے پھر تعمیر خود ہی آسان ہو جائیگی۔

حکمتِ کلیمی و حکمتِ فرعونی

اِس تمہید کے بعد حکمت کلیمی اور حکمت فرعونی کا موازنہ شروع ہوتا ہے حکمت کلیمی انسان کو درس لاخوفٌ علیہم ولاھم یحزنون دیکر عزم و تسلیم و رضا کے چراغ قلب میں روشن کر دیتی ہے جس کی روشنی میں وہ اپنی مراد کے موافق جہان کو نئے طور پر تعمیر کرتا ہے برخلاف اس کے حکمت فرعونی مکروفن کا جال بچھاتی ہے۔ اس کی درسگاہ میں جی حضور کی تعلیم ہوتی ہے۔ شیخ ملت دین کو توڑ مروڑ کر آقاؤں کے حسب دلخواہ پیش کرتا ہے۔ جو بوڑھے ہیں وہ حیا سے بیگانہ ہو جاتے ہیں جو جوان ہیں ان میں نسائیت پیدا ہو جاتی ہے۔ فیشن کے دیوانے مردہ دل۔ اور جو لڑکیاں ہیں ان کا کیا پوچھنا۔ بڑی بیباک زبان قینچی کی طرح چلتی ہوئی بنی ٹھنی اپنی چھب دکھاتی پھرتی ہیں۔ ملت میں جب ایسے ارکان ہوں تو ان کی صبح شام سے بھی زیادہ تاریک ہے۔ انکی کوشش ہے تو بس پیٹ بھرنے کے لیے اور خوف ہے تو بس موت کا۔ جو مالدار ہیں وہ عیش پسند اور کنجوس۔ چھلکا دیکھتے ہیں۔ مغز کی خبر نہیں۔ حاکمان مجازی ان کے معبود ہیں ایمان جائے مگر انکی خوشنودی حاصل رہے۔ افسوس حرم کی اینٹ سے دیر کی تعمیر ہوئی۔ آہ قوم نے حق سے منھ موڑ لیا وہ مرسلؐ گراب تک نہ سمجھی!

لا الٰہ الا اللہ

یہ دلخراش منظر دکھا کر اقبال کلمہ طیبہ لاالٰہ الا اللہ کی سرخی کے تحت میں لا اور الا کے مفہوم کو فلسفہ اور تاریخ کی روشنی میں پیش کرتے ہیں لا سے امتوں کا جلال ظاہر ہوتا ہے اور الا سے انکا جمال نظر آتا ہے لا اور الا کائنات کے فتح باب ہیں۔ لا سے حرکت پیدا ہوتی ہے اور الا سے سکون لا مردِ خدا کی پہلی منزل ہے۔ یہ بجلی کی کڑک ہے بانسری کی آواز نہیں ہے۔ اس کی ضرب سے لات و منات ریزہ ریزہ ہو گئے۔ قیصر و کسرای ہلاک ہو گئے۔ ایک نیا جہان پیدا ہوا۔ اور غیر اللہ کا نقش مٹ گیا۔

یہ اسی لا کی صبح خیزی تھی کہ اب بیدھڑک اذاں دی جاتی ہے اور یہ اسی لا کی تخم ریزی ہے کہ اسلام کا کھیت لہلہا رہا ہے۔ دیکھو لالہ کی شمع جو روشن ہے اسی لا کی ندی کے کنارے سے لائے ہیں۔ خیر یہ تو عرب کا اعجاز تھا ابھی کل کی بات ہے کہ دورِ فرنگ میں جو انقلاب روس میں ہوا ہے وہ اسی لا کا کرشمہ ہے۔ ع

"لا سلاطیں لا کلیسا لا الٰہ"

مگر روسی لا کی آندھی سے اپنے گھوڑے کو الا کی طرف ابھی تک نہیں لیجا سکے کیا عجب کہ ایک دن وہی "جنون" زور کرے اور وہ اس آندھی سے بچ جائیں حقیقت یہ ہے کہ لا اور الا دونوں امتوں کا ساز و برگ ہیں۔ اگر نفی کے ساتھ اثبات نہ ہو تو انکو موت آجاتی ہے۔

اشکے چند بر افتراق ہندیاں

اقبال پر جو لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ انھوں نے ملیت کے جوش میں وطنیت سے منھ موڑ لیا۔ وہ اس عنوان کے چند اشعار جو مرحوم کی

آخر عمر کے اشک خونیں ہیں پڑھیں اور پھر خود ہی انصاف کریں ۔

اے ہمالاے اٹک اے رود گنگ — زیستن تا کے چناں بے آب و رنگ
پیر مرداں از فراست بے نصیب — نوجواناں از محبت بے نصیب
شرق و غرب آزاد و ما نخچیر غیر — خشت ما سرمایۂ تعمیر غیر
زندگانی بر مراد دیگراں — جاوداں مرگ است نے خواب گراں
ہندیاں با یک دگر آویختند — فتنہ ہائے کہنہ باز انگیختند
تا فرنگی قومے از مغرب زمیں — ثالث آمد در نزاع کفر و دیں
کس نداند جلوۂ آب از سراب — انقلاب اے انقلاب اے انقلاب

اے ہمالہ تو دنیا میں سب سے اونچا پہاڑ ہے اور اے اٹک اور گنگا تم کس فیاضی سے دودھ کی نہریں بہا رہی ہو ہم کہاں تک اس طرح جئیں کہ نہ کچھ آبرو ہے اور نہ چہروں پر کچھ رونق۔ ہم پست ہیں اور زار و نزار۔ ہمارے پیر مرد یہ سمجھتے ہی نہیں کہ زمانہ کیسی چالیں چل گیا اور ہمارے نوجوانوں کی یہ حالت ہے کہ ان میں محبت کی گرمی ہی نہیں لال لہو سفید ہو گیا۔ پورب پچھم جدھر آنکھ اٹھاتے ہیں آزاد قومیں نظر آتی ہیں مگر ہم ہیں کہ غیر جانوروں کی طرح ہمارا شکار کھیل رہے ہیں۔ ہم مر مر کر اینٹیں بچائیں اور غیر اُن سے سونے کے محل کھڑے کریں۔ ہماری زندگی کا کھلونا دوسروں کے ہاتھوں میں ہے جب تک جی چاہے کھیلیں جب چاہیں توڑ ڈالیں کون کہتا ہے ہم گہری نیند میں ہیں ہم تو مر چکے!!

آہ مادرِ ہند کے فرزند آپس ہی میں لڑ رہے ہیں۔ پرانے فتنے پھر جاگ اُٹھے کہیں مسجد کے سامنے باجہ بجانے پر خون کی ندیاں بہتی ہیں اور کہیں گاؤکشی پر انسانوں کی قربانیاں بیدریغ ہوتی ہیں کتنے شرم کی بات ہے کہ دونوں قوموں کے مذہبی پیشوا اور لیڈر باہمی فیصلہ نہیں کرتے بلکہ غیر قوم کے مغربی حاکم بیچ بچاؤ کے لئے آتے ہیں۔ پیاسے تو سب ہیں مگر یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ آب ہے یا سراب۔ ہم ترقی کے زینہ پر چڑھ رہے ہیں یا تنزل کر گڑھے میں گر رہے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک انقلاب عظیم ہونے والا ہے تب کہیں ہماری آنکھیں کھلیں گی ۔

پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق احوال جب اسقدر زار و زبوں ہے تو اقوام شرق کو کرنا کیا چاہیئے۔ سب سے پہلے یہ خیال پختہ ہو کہ اب مشرق کی رات ختم ہوئی سورج نکلنے کو ہے پھر یورپ کی موجودہ حالت پر غور کیا جائے ۔

یورپ نے جو "لادینی" کا طریقہ (یعنی امور سلطنت میں دین سے بے تعلق رہنا) اختیار کیا وہ اصل میں ایک تلوار ہے جس کی ضرب سے وہ خود زخمی ہو کر تڑپ رہا ہے۔ اس کی نگاہ میں انسان جسم و جسمانیت ہے جس میں روحانیت کا

پتہ نہیں، اس لئے اس کا دل پتھر ہے اور آنکھ میں آنسو نہیں۔ جبریل بھی اس کی صحبت میں ابلیس بن گیا۔ اس کا علم دو ہتر کندہ ہے۔ پر تلوار رکھے ہوئے نوعِ انسان کی ہلاکت میں مصروف ہے۔ بیشک جبتک عقل دل کے تابع ہے یزدانی رہتی ہے۔ لیکن جہاں دل کی اطاعت سے آزاد ہوئی شیطان بن گئی حبشہ کا حادثہ کسقدر عبرت انگیز ہے بھیڑیوں کو یورپ نے بے تکان چھوڑ دیا کہ میمنے کو چیر پھاڑ کر کھا جائیں۔ اور جنیوا لیگ اقوام میں کیا ہو رہا ہے وہی کر وفن۔ وہی کفن چور ہیں جو کہتے ہیں اس بیل کو تو مارے ہیں اس نیل گاؤ کو گرائے دیتا ہوں الٰہی توبہ یہ کیا آشوب عالم ہے!

اے اہلِ مشرق تم نے یورپ کا رنگ دیکھ لیا اب اس رنگ سے پاک ہو جاؤ۔ مشرق کی آبرو تمھارے ہاتھ ہے۔ یہ جو قدیم تہذیب کے نام لیوا بکھرے ہوئے ہیں۔ انکی شیرازہ بندی کرو اور صدق و صفا کا جھنڈا اونچا کرو۔ اہل حق کی زندگی قوت سے ہے اور ہر ملت کی قوت جمعیت سے ہے۔

اے سرزمین ایشیا۔ اے خاکِ خاور۔ اے تہذیب اور دین کی دولت کے امین اُٹھ اور اپنی قوموں کی گتھیوں کو خود ہی سُلجھا۔ یورپ کے نشہ کو اتار دے۔ اور دیو سفید کے پنجہ سے آزاد ہو جا۔ تو نے اس کی کارستانیاں خوب دیکھ لیں سلطنت اب سوداگری بن گئی ہے۔ ایسے سوداگروں کی زبان تو میٹھی ہوتی ہے۔ مگر دل بِس کی گانٹھ۔ انکی ریشمی پوشاک سے اپنی گدڑی بہتر ہے۔ سڑا کے کے جاڑے کسی طرح بسر کر دے مگر انکی پوتیں مت خریدنا انکی ترکیبیں عجیب ہیں بغیر لڑائی کے مار ڈالتے ہیں اور انکی مشینوں میں موت چکر کھاتی ہے۔ اپنی چٹائی پر بیٹھ اور ان کے قالین نہ لے اور اور یہ جو مشک بیچ رہے ہیں وہ کتے کی ناف سے نکلا ہے نافۂ آہو نہیں ہے۔ ان کے زرم زرم مخملی گدے رہزن ہوش ہیں۔ دیکھ تیری پگڑی ان کے کپڑے سے نہ بنے ورنہ وہ اچھال دیں گے جو ہوشمند ہیں وہ انکی شراب منہ سے نہیں لگاتے اور جنھوں نے ایک گھونٹ پیا بس وہیں ختم ہو گئے۔

پس اے اہلِ مشرق اپنی ہی سرزمین کی چیزیں کھاؤ پہنو اور بیچو۔ دیکھو تم میں جو عقلمند ہیں وہ اب اپنی کلی آپ بن رہے ہیں۔ یہ یورپ والے جلا کے چلتے پرزے ہیں۔ ریشم تم سے لیتے ہیں۔ پھر مال بنا کر تمھارے گلے منڈھتے ہیں۔ حیف صد حیف دریا اپنے ہی موتی غوطہ خور سے خریدے!

آہ! اقبال

از
حضرت
مولانا ظفر علی خاں صاحب

گھر گھر یہی چرچے ہیں کہ اقبال کا مرنا — اسلام کے سر پہ ہے قیامت کا گزرنا
کلکتہ و کابل میں بھی ہے صفِ ماتم — اس غم میں سیہ پوش ہیں بغداد و سمرنا
تھا اس کے تخیل کا فسوں جس نے سکھایا — سو سال کے سوئے ہوئے جذبوں کا ابھرنا
سرمہ زدیا اس نے مسلماں کو یہی درس — ہرگز کسی سے بجز اللہ کے ڈرنا
ملت کو نئی زندگی اقبال نے بخشی — ممکن نہیں اس بات کا اقرار نہ کرنا

پیامِ اقبال کے تین دور

جناب سراج احمد صاحب علوی ایم اے

یہ معرکۃ الآرا مقالہ اقبال ڈے کے جلسہ میں جو اسکول کی انجمن ارباب ادب کے زیر اہتمام منعقد ہوا تھا پڑھا گیا تھا اس کے ضروری اور اہم اقتباسات شائع کئے جاتے ہیں:- (مدیر)

علامۂ اقبال کی ہستی کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے۔ اور نہ ان کے پیام کی نوعیت سے روشناسی ضروری ہے اس صحبت میں میں صرف یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اقبال نے دنیا اور بالخصوص مسلمانوں کو جو پیغام پہنچانے کا بیڑا اٹھایا ہے، وہ کس رنگ میں پہنچا اور زمانہ کی رفتار کے ساتھ طریقِ پیغام رسانی اور طرزِ اشاعت میں کیا کیا تبدیلیاں پیدا ہوتی گئی ہیں نیز طریقۂ کار میں تبدیلیاں کن اسباب کے ماتحت ہوئیں۔

اگرچہ اقبال کا پیغام اُن کے جملہ اُردو اور فارسی تصانیف کے ذریعہ پہنچایا گیا ہے۔ لیکن یہاں میں صرف اُن کے اُردو کلام سے موضوع مذکورہ پر روشنی ڈالنے کی کوشش کروں گا۔

اس سے پہلے کہ اقبال کے پیغام کے متنوع انداز کا ذکر کیا جائے اُن کے پیغام کا ایک اجمالی خاکہ یادداشت کو تازہ کرنے کے لئے پیش کر دینا بیجا نہ ہوگا۔

اقبال کے پیغام کو سمجھنے سے پہلے یہ بھی جان لینا ضروری ہے کہ اقبال کی ذات کتنے کمالات کی جامع ہے اقبال اگر ایک طرف فلسفہ کے بہت بڑے ماہر ہیں اور یورپ کے فلسفیوں کے مدرسوں کے سند یافتہ ہیں۔ تو دوسری طرف وہ مشرق کے صوفیوں کے رموز و اسرار سے بھی باخبر ہیں ایک جانب اگر مغربی علوم کے چشموں سے انھوں نے اپنی پیاس بجھائی ہے تو دوسری جانب انھیں مشرقی علوم کے باغوں سے خوشہ چینی کا کافی موقعہ حاصل ہوا ہے وہ اگر موجودہ زمانہ کی سیاست اور تمدن کے اصول سے باخبر ہیں تو تہذیبِ کہن کے آئین و نقوش بھی انھیں یاد ہیں اگر موجودہ دور کی تاریخ سے وہ باخبر ہیں۔ تو افسانہائے پارینہ بھی اُنکے دماغ کے نہاں خانوں میں محفوظ ہیں۔ غرض اقبال ایک ہی وقت میں فلسفی، صوفی، سیاستداں، تاریخ داں، مدبر، عالم اور مفکر سب کچھ ہیں۔ اور سب پر طرّہ یہ کہ وہ شاعر ہیں۔ خود جذبات کے مالک ہیں اور دوسروں کے جذبات کے ترجمان بھی ہیں۔ خود بھی جذبات کی لہروں میں ڈوب جاتے ہیں اور دوسروں کے جذبات میں بھی تموّج اور تلاطم پیدا کر سکتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ اتنے اوصاف رکھنے والا شخص کیا کچھ نہ ہوگا کیا کچھ نہیں ہو سکتا اور کیا کچھ نہیں کر سکتا اقبال اوصافِ متذکرہ بالا سے متصف ہونے کے علاوہ ایک اور وصف کے بھی مالک ہیں جس نے ان کے جملہ اوصاف کو چار چاند

لگا دیئے ہیں اور وہ یزداں پرستی اور خدائیت اسلام کا وصف ہے ان کے سینے کے اندر ایک تڑپتا ہوا دل ہے ان کے سینے میں غیرت ملّی اور حمیت دینی کے جذبات کی روانی ہے اور قومی خودداری اور شخصی احساسات کا ندرہے۔ اسلام کی عالیشان عمارتوں کے کھنڈروں میں انہیں اب تک ان عمارتوں کے اصلی نقش و نگار، عظمت اور بلندی کے نقشے نظر آتے ہیں، اقبال کی دُوررس اور دُوربیں نظریں اسلاف کی مادی اور روحانی ترقیوں کے خزائن کا پتہ پا جاتی ہیں اور ان کے سامنے ان کے کارناموں اور ان کے پاکیزہ کرداروں کی تصویریں کھنچ جاتی ہیں۔ انہیں افسانہائے پارینہ کی روایات از بر یاد ہیں جو اسلام کے دور گذشتہ کی پُرشکوہ داستانوں سے بھری ہیں۔

جب وہ ماضی کے ان آئینوں میں حال کی تصویریں دیکھتے ہیں تو اُن کا دل لرزنے لگتا ہے، وہ دیکھتے ہیں کہ اسلام اور اسلام کے نام لیو کس سرعت کے ساتھ منتہائے علو و رفعت سے پستی کی طرف جا رہے ہیں۔ موجودہ زمانے کے علوم و سائنس و فلسفہ کی روشنی اُنکی آنکھوں میں کیسی بیجا چوندھ پیدا کر رہی ہے۔ اور انکی بصیرت اور بصارت کس طرح معطل اور بیکار ہو رہی ہے اور وہ کس آسانی سے یقین و ایمان کے بیش بہا خزانوں کو خزف پاروں سے بدل رہے ہیں اور اپنی کم نگاہی کے باعث ان خزف پاروں سے اپنے دامن بھر رہے ہیں اور یورپ کی تہذیب اس کا تمدن۔ اس کی سیاست کس طرح سرمایہ کی "تلاش فکر اور ہوس مشرقی اقوام اور بالخصوص مسلمانوں کو کس کس طرح بے زر، مفلوک الحال بنا رہی ہیں۔ اور کس کس حیلے سے ان کے لئے میدان عمل تنگ، ترقی کی راہیں مسدود، اور قوت فکر و عمل کو بیکار و معطل کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔

یہ مناظر دیکھکر اُن کا دل تڑپ اٹھتا ہے اور وہ ان قابل نفریں مناظر کو بدلنے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں اور اپنی تمام قوتوں کو ایک مرکز پر لاکر قوم کو سُدھارنے کی کوشش میں مشغول ہو جاتے ہیں اور یہیں سے اقبال کے پیغام کی بنیادیں پڑ جاتی ہیں اور چونکہ وہ فطرتاً شاعر ہیں اور اس حقیقت سے واقف ہیں کہ جذبات تمام افعال اور ادراکات کا سرچشمہ ہیں اور جذبات میں تحرک پیدا کرنے کے لئے شعر سے زیادہ موزوں آلہ نہیں ہے اس لئے وہ صدیوں کے جامد جذبات میں اپنے اشعار سے جان ڈالنا چاہتے ہیں۔

پیغام کی ابتدا:- علامہ اقبال کی شاعری بیسویں صدی سے چند سال پہلے شروع ہوئی۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ وہ مدرسہ سے کالج اور کالج سے یونیورسٹی کے مدارج علمیہ طے کر رہے تھے ظاہر ہے کہ اس زمانے میں سوائے درسیات کے کسی ذہین اور علم کے فدائی کو بیرونی دنیا کے اور حالات سے بہت کم سروکار رہتا ہے اقبال بھی اس سے مستثنےٰ نہیں تھے، اور کیفیت ان کے سفر انگلستان کرنے سے پہلے تک قائم رہی لیکن اُس زمانے کی شاعری سے بھی یہ پتہ چلتا ہے کہ اُن کی فطرت میں تاثر پذیری کے جراثیم موجود تھے وہ قوم اور ملک میں کسی خامی کو دیکھنا پسند نہ کرتے تھے چنانچہ ایک جگہ ملک کے اندر نفاق و افتراق اور عصبیت کے آثار دیکھکر اُن کے جذبات کو ٹھیس

لگتی ہے اور کہہ اُٹھتے ہیں :-

سرزمیں اپنی قیامت کی نفاق انگیز ہے　　وصل کیسا یاں تو اک قرب فراق آمیز ہے
لذتِ قربِ حقیقی پر مٹا جاتا ہوں میں　　اختلاطِ موجہ و ساحل سے گھبراتا ہوں میں

اور ان کے تاثرات ختم نہیں ہوجاتے ہیں بلکہ وطن کی دبونِ حالی اور اُس کے باشندوں کے جمود کو دیکھکر اُن کی دُور بیں نگاہیں اُس خطرے کو دیکھ لیتی ہیں جو جہل . ناا تفاقی اور کوتاہ بینی سے آیندہ پیدا ہونے والے ہیں وطن کی بربادی وہ نہیں دیکھ سکتے اپنے دردکا یوں اظہار کرتے ہیں :-

مرا رونا نہیں رونا یہ ہے سارے گلستاں کا　　وہ گل ہوں میں خزاں ہر گل کی ہے گویا خزاں میری

اور رونے کی وجہ یہ بتلاتے ہیں کہ :-

رُلاتا ہے ترا نظارہ اے ہندوستاں مجھکو　　کہ عبرت خیز ہے تیرا فسانہ سب فسانوں میں

افسانہ کی وضاحت کرتے ہیں :-

نشانِ برگِ گل تک بھی نہ چھوڑ اس باغ میں گلچیں　　تری قسمت سے رزم آرائیاں ہیں باغبانوں میں

لیکن تشخیص مرض کے بعد اُس کا علاج بھی تجویز ہوتا ہے :-

محبت ہی سے پائی ہے شفا بیمار قوموں نے　　کیا ہے اپنے بختِ خفتہ کو بیدار قوموں نے
مرض کہتے ہیں سب اسکو یہ ہے لیکن مرض ایسا　　چھپا جسمیں علاجِ گردشِ چرخِ کہن بھی ہے

۱۹۰۵ء میں اقبال یورپ کے علوم وفنون سے مستفید ہونے کے لئے عازمِ انگلستان ہوئے اور ۱۹۰۸ء میں مختلف ممالک کی سیر کرنے کے بعد واپس ہوئے یہ زمانہ اگرچہ زیادہ تر سیر و سیاحت میں گذرا مگر اُن کی تمام قوتوں کو بیدار کرنے میں بہت معاون ہوا ، اور انھوں نے یورپ کے سرچشموں سے جو سیرابی کی اُنکی شوریت کا مزہ ابتک کام و دہن سے نہیں نکلا ہے اسی زمانے میں یورپی تہذیب و تمدن اور خیالات معاشرت کی سطاحت کے راز اُن پر کھل گئے . اگرچہ اس کا اظہار انھوں نے کم کیا مگر پھر بھی حقیقت کہیں کہیں نظر آجاتی ہے ۔

مثلاً مے فرنگ کی اصلیت کا پردہ فاش ہوجانے کے بعد وہ خاموش نہ رہ سکے اور انکی زبان سے نکل گیا .

پیرِ مغاں فرنگ کی مے کا نشاط ہے اثر　　اسمیں وہ کیفِ غم نہیں مجھکو تو خانہ ساز دے

یا یہ کہ عشق کی ماہیت اور سعی و طلب کی اہمیت جو بعد کی منزلوں میں انکے فلسفۂ متحرک اور مسئلہ یقین کی صورتوں میں بدل جاتی ہیں اُن کی جھلک بھی نظر آتی ہے مثلاً طلبائے علی گڈھ کے نام پیام پہنچتا ہے تو یہ کہ :-

موت ہے عیشِ جاوداں ذوقِ طلب اگر نہ ہو　　گردشِ آدمی ہے اور گردشِ جام اور ہے

یا ...... صفروں کی گود میں پلی دیکھکر عشق کی گہرائی سمجھ میں آجاتی ہے :-

شیشۂ دہر میں مانندِ مئے ناب ہے عشق　　روحِ خورشید ہے خونِ رگِ مہتاب ہے عشق

عشق کی تڑپ کے ساتھ ساتھ شاعر میں ملی و قومی جذبات بھی جاگ اُٹھتے ہیں اور جب عشق یہ پیغام دیتا ہے کہ :-

وجودِ افراد کا مجازی ہے ہستیِ قوم ہے حقیقی　　فدا ہو ملت پہ یعنی آتش زنِ طلسمِ مجاز ہو جا

اور پھر یہ کہ "بچا کے دامن بتوں سے اپنا غبارِ راہِ حجاز ہو جا"

تو ان کے جذبات میں عمل کی شورشیں پیدا ہو جاتی ہیں اور سر عبدالقادر کے نام جو خط تحریر ہوتا ہے وہ اس کاوش کا ثبوت ہے

اُٹھ کہ ظلمت ہوئی پیدا افقِ خاور پر　　بزم میں شعلہ نوائی سے اُجالا کر دیں

اہلِ محفل کو دکھا دیں اثرِ صیقلِ عشق　　سنگِ امروز کو آئینۂ فردا کر دیں

شمع کی طرح جئیں بزمگہِ عالم میں　　خود جلیں، دیدۂ اغیار کو بینا کر دیں

اس چمن کو سبق آئینِ نمو کا دے کر　　قطرۂ شبنمِ بے مایہ کو دریا کر دیں

ہر چہ در دل گزرد وقفِ زباں دارد شمع

سوختن نیست خیالے کہ نہاں دارد شمع

اس عشق اور تڑپ کا نتیجہ یہ ہے کہ جب وہ سسلی (صقلیہ) سے گزرتے ہیں تو یہ دیکھ کر کبھی اس ہی عشق کے دیوتا سے اکتساب حاصل تھا اس کی سقیم حالت اور اغیار پروری پر آنسو بہاتے ہیں :-

رو لے اب دل کھول کر اے دیدۂ خونابہ بار　　وہ نظر آتا ہے تہذیبِ حجازی کا مزار

آہ اے سسلی سمندر کی ہے تجھ سے آبرو　　رہنما کی طرح اس پانی کے صحرا میں ہے تو

تو کبھی اس قوم کی تہذیب کا گہوارہ تھا　　حسنِ عالم سوز جس کا آتشِ نظارہ تھا

اور اپنے تاثرات کا نقش دوسروں پر بٹھانا چاہتے ہیں اور دوسروں کو بھی سلف کی اس یادگار کی زبون حالی کا تصور دکھانا چاہتے ہیں :-

میں ترا تحفہ سوئے ہندوستاں لیجاؤں گا　　خود یہاں روتا ہوں، اوروں کو وہاں رلواؤں گا

صقلیہ کا یہ تحفہ لئے ہوئے وہ ۱۹۰۸ء میں ساحلِ ہندوستان پر قدم رکھتے ہیں اور قوم کو درس دینا شروع کرتے ہیں سیاحت کی برکت نے اس حقیقت کو انکی نگاہوں کے آگے بے نقاب کر دیا کہ دنیائے اسلام کے منتشر اجزا اگر ایک سلسلہ میں مربوط ہو جائیں تو موجودہ کمزوری اور ترتیبی جو نظامِ ملت میں پیدا ہے دور ہوتے دیر نہیں لگے گی۔ اس خیال سے وہ پان اسلامزم کے فوائد قوم کو بتلاتے ہیں۔ چنانچہ وہ ان مقاماتِ مقدسہ کی تصویریں قوم کے سامنے پیش کرتے ہیں جو اسلاف کے تمدن علم اور عمل کا گہوارہ رہے ہیں اور ایک مخفی اشارہ کرتے ہیں کہ ان مراکز کا اتحاد اب بھی بہت کچھ کارآمد ثابت ہوگا اور یہ اتحاد ملت کی زندگی کے لئے بہت ضروری ہے۔ اسی سلسلہ اتحاد میں وہ دہلی بغداد قسطنطنیہ اور مدینہ کو مربوط

کرنا چاہتے ہیں:۔

دہلی
سرزمیں دلی کی مسجودِ دلِ غمدیدہ ہے — ذرّے ذرّے میں لہو اسلاف کا خوابیدہ ہے
پاک اس اجڑے گلستاں کی نہ ہو کیونکر زمیں — خانقاہِ عظمتِ اسلام ہے یہ سرزمیں

بغداد
ہے زیارت گاہِ مسلم گو جہان آباد بھی — اس کرامت کا مگر حقدار ہے بغداد بھی
خاک اس بستی کی ہو کیونکر نہ ہمدوشِ ارم — جس نے دیکھے جانشینانِ پیمبر کے قدم

قسطنطنیہ
صورتِ خاکِ حرم یہ سرزمیں پاک ہے — آستانِ مسند آرائے شہِ لولاک ہے
نکہتِ گل کی طرح پاکیزہ ہے اس کی ہوا — تربتِ ایوب انصاری سے آتی ہے صدا
اے مسلماں ملتِ اسلام کا دل ہے یہ شہر — سینکڑوں صدیوں کی کشت و خوں کا حاصل ہے یہ شہر

مدینہ
وہ زمیں پاک ہے تو خوابگاہِ مصطفیٰ — دید ہے کعبے کو تیری حجِ اکبر سے سوا
آہ یثرب دیس ہے مسلم کا تو ماوا ہے تو — نقطۂ جاذب تاثر کی شعاعوں کا ہے تو
جب تلک باقی ہے تو دنیا میں باقی ہم بھی ہیں — صبح ہے تو اس چمن میں گوہرِ شبنم بھی ہیں

لیکن ایک جوش سے بھرا دل زیادہ دیر تک خارجی اثرات سے مرعوب ہو کر جذبات کو دبا نہیں سکتا۔ بالآخر اسلام کا درس مبہم طریقہ سے دینے کے میدان سے رہا نہ گیا اور انھوں نے صاف کہہ ڈالا کہ

چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا — مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا

جس طرح بچہ نادانی سے کبھی گر پڑتا ہے یا ٹھوکر کھا کر رونے لگتا ہے تو ماں باپ اسکو بھلا دینے کے لئے اور بہلانے کے لئے کسی جامد شئے کو مارنے لگتے ہیں اور بچہ چپ ہو جاتا ہے لیکن بعد میں سمجھاتے ہیں کہ دیکھ کر چلا کرو تاکہ ٹھوکر نہ کھاؤ اور رودو کر نہ چلو، اسی طرح اقبال جہالت اور غفلت کے گہوارے میں سوئی ہوئی نادان قوم کا دل رکھنے کے لئے اس کی طرف سے مچل مچل کر اللہ میاں سے شکوہ کرتے ہیں کہ تو نے ہمیں چھوڑ دیا ہم نے جو کارہائے نمایاں تیرے دین کو پھیلانے کے لئے انجام دیئے وہ بھول گیا۔ تیرا نام تمام دنیا میں پھیلایا اور تو نے اس کا ہم کو یہ بدلہ دیا کہ دنیا میں ہمیں ذلیل و خوار کیا۔ ہماری ترقی مسدود ہو گئی۔ اغیار نے ہمیں بے دست و پا بنا دیا، مثلاً

تیرے کعبے کو جبینوں سے بسایا ہم نے — تیرے قرآن کو سینے سے لگایا ہم نے
پھر بھی ہم سے یہ گلہ ہے کہ وفادار نہیں — ہم وفادار نہیں تو بھی تو دلدار نہیں

ساتھ ہی ساتھ یہ بھی شکایت ہے کہ:۔

رحمتیں ہیں تیری اغیار کے کاشانوں پر — برق گرتی ہے تو بیچارے مسلمانوں پر

اور کبھی یہ دھمکی دیتے ہیں:۔

ہم تو رخصت ہوئے اوروں نے سنبھالی دنیا　　پھر نہ کہنا ہوئی توحید سے خالی دنیا

جب قوم کی وکالت کر کے ان کو بہلا لیتے ہیں تو پھر انھیں بھی نصیحت کے پیرائے میں سرزنش کرتے ہیں کہ امت سے شکوہ ہو چکا اب ذرا اپنے گریبانوں میں منھ ڈال کر دیکھو کہ خود تمھارے حرکات و سکنات کس حد تک قابل تعریف ہیں۔

ہاتھ بے زور ہیں الحاد سے دل خوگر ہیں　　امتی باعثِ رسوائی پیغمبر ہیں

بت شکن اٹھ گئے باقی جو رہے بت گر ہیں　　تھا براہیم پدر اور پسر آذر ہیں

اور یہی نہیں بلکہ تمھاری مذہب سے روگردانی اور لا مذہبیت ہی تمھاری خواری کا ایک سبب ہے :-

قوم مذہب سے ہے مذہب جو نہیں تم بھی نہیں　　جذب باہم جو نہیں محفل انجم بھی نہیں

تم فلسفے کی مہمل کاریوں میں اس طرح پھنس گئے ہو کہ تعلیمات اسلامی کی کنہ تک پہنچنے کی تم میں صلاحیت باقی نہیں رہ گئی ہے اور افعال میں تصنع بے اطمینانی اور شک و شبہہ کے عناصر پائے جاتے ہیں ۔

رہ گئی رسم اذاں روح بلالی نہ رہی　　فلسفہ رہ گیا تلقینِ غزالی نہ رہی

مسجدیں مرثیہ خواں ہیں کہ نمازی نہ رہے　　یعنی وہ صاحبِ اوصاف حجازی نہ رہے

تم نے اپنی وضع قطع تک بدل ڈالی ہے تمھاری صورت اور سیرت اس حد تک مسخ ہو گئی ہو گئی ہے کہ تم پہچان نہیں پڑتے۔ تمھارا تمدن جو مساوات کی بنیادوں پر بنا تھا تم نے اسے اغیار کے اتباع میں نیست کر ڈالا :-

وضع میں تم ہو نصاریٰ تو تمدن میں ہنود　　یہ مسلماں ہیں جنھیں دیکھ کے شرمائیں یہود

یوں تو سید بھی ہو مرزا بھی ہو افغاں بھی ہو　　تم سبھی کچھ ہو بتاؤ کہ مسلمان بھی ہو

اس طرح وہ قوم کو ان کی تنزلی اور پستی کے اسباب جو مبرہن اور عیاں ہیں بتا کر انھیں چھوڑنے کی ترغیب دیتے ہیں اور اسلاف کی تماثیل پیش کر کے انھیں اپنی کھوئی ہوئی پونجی واپس لینے کی ترغیب دیتے ہیں ۔

کبھی حضرت بلال کے بقائے ودوام کی مثال پیش کر کے دعوتِ عشق دیتے ہیں :-

اقبال کس کے عشق کا یہ فیض عام ہے　　رومی فنا ہوا حبشی کو دوام ہے

کبھی قوم کو عشق کی منزلوں میں رہتے ہوئے میدان ہستی میں تنازع للبقا کے لئے تیار کرتے ہیں :-

تمنا آبرو کی ہو اگر گلزار ہستی میں　　تو کانٹوں میں الجھ کر زندگی کرنے کی خو کر لے

لیکن اس کے ساتھ ہی پستی غلامی اور محکومی کی زندگی کو زندگی نہ سمجھنے پر بھی مصر ہیں :-

نہیں یہ شان خودداری چمن سے توڑ کر تجھکو　　کوئی دستار میں رکھ لے کوئی زیب گلو کر لے

صنوبر باغ میں آزاد بھی اور پا بگل بھی ہے　　انھیں پابندیوں میں حاصل آزادی کو تو کر لے

وہ یہ محسوس کرتے ہیں کہ قوم کی ادبار اور پستی کی ایک بڑی وجہ ان میں ہمت سعی کی کمی اور عقل کا فقدان ہے اس لئے

وہ صاف صاف بتا دیتے ہیں کہ محنت و مشقت اور عمل پیہم میں کامیابی کا راز پوشیدہ ہے،

زندگانی کی حقیقت کوہکن کے دل سے پوچھ جوئے شیر و تیشہ و سنگِ گراں ہے زندگی

لیکن جہاں زندگی کے عمل پیہم اور سعی کی ضرورت ہے وہاں یقین اور ایمان کا ہونا ضروری ہے اس لئے کہ بغیر ایمان کی استواری کے ثباتِ زندگی ناممکن اور ایمان نام ہے "من کان للہ کان اللہ لہ" اس لئے مردِ مومن کا ہر فعل، فعلِ ایزدی کے مترادف ہے اور وہ ہر طرح سے تائیدِ ایزدی سے استوار رہتا ہے۔ یہ بات اسی وقت حاصل ہو سکتی ہے جب ایک شخص یہ سمجھتا ہو کہ کوئی ذات ایسی موجود ہے جس کے اندر تکوین اور تخلیق کی قوتیں بدرجہ اتم موجود ہیں اور جس کا دائرہ اختیار لامتناہی ہے اس خیال کے ساتھ اس کے عمل اور قوتِ عمل میں ایک استواری پیدا ہو جائیگی۔

ثباتِ زندگی ایمانِ محکم سے ہے دنیا میں کہ المانی سے بھی پائندہ تر نکلا ہے تورانی

پھر وہ یہ تلقین اس طرح کرتے ہیں:-

غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمشیریں نہ تدبیریں جو ہو ذوقِ یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں
کوئی اندازہ کر سکتا ہے اُسکے زورِ بازو کا نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

اور یہی نہیں بلکہ ایمان کی قوت اس قدر انسان کو وسیع اختیارات کا بنا دیتی ہے کہ:-

ولایت، پادشاہی، علمِ اشیا کی جہانگیری یہ سب کیا ہیں فقط اک نکتۂ ایماں کی تفسیریں

انسان ایمان کی دولت اور عمل اور خلوص کے ذریعہ کارزارِ حیات میں فاتح کی حیثیت سے نمایاں ہو جاتا ہے:-

یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتحِ عالم جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

اور یہ ایقان ہی آگے بڑھکر قوم کی تعمیر میں معاون ہوتا ہے اور مذہب و ملت اس کے سایہ میں پلتے ہیں

یقیں افراد کا سرمایۂ تعمیرِ ملت ہے یہی قوت ہے جو صورت گرِ تقدیرِ ملت ہے

اقبال کا پیغام یہیں ختم نہیں ہو جاتا بلکہ جہاں وہ مردہ جذبات میں روح پھونکنے کی کوشش کرتے ہیں وہاں مغرب کی نظر فریب تمدنی اور مادی ترقیوں کا پول بھی کھولتے جاتے ہیں تاکہ سادہ لوح قوم ہوشیار رہے۔

وہ سلطنت اور ملوکیت کو مغربی اقوام کی شعبدہ بازی سے تعبیر کرتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ ملوکیت کی آڑ میں نظامِ جمہوری کو بنایا گیا ہے اور در اصل قیصریت اور استبدادی حکومت کا دور دورہ ہے

آ بتاؤں تجھ کو رمزِ آیۂ ان الملوک سلطنت اقوامِ غالب کی ہے اک جادوگری
خواب سے بیدار ہوتا ہے ذرا محکوم اگر پھر سلا دیتی ہے اس کو حکمراں کی ساحری
ہے وہی سازِ کہن مغرب کا جمہوری نظام جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری

اس پردہ دری کے ساتھ وہ یہ بھی بتا دیتے ہیں کہ فطرتِ مسلم میں کتنی قوتیں ودیعت ہیں اُسے دریوزہ گری کی،

ضرورت نہیں صرف ہوش میں آنے کی دیر ہے۔ مگر یورپ کے تہذیب کی وقعت زجاج سے کم نہیں اور اسکے اندر انتہائی وحشت بربریت اور درندگی پائی جاتی ہے:۔

ابھی تک آدمی صیدِ زبونِ شہریاری ہے — قیامت ہے کہ انساں نوعِ انساں کا شکاری ہے
نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیبِ حاضر کی — یہ صناعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے
وہ حکمت ناز تھا جس پر خردمندانِ مغرب کو — ہوس کے پنجۂ خونیں میں تیغِ کارزاری ہے

یہ تھا اقبال کے پیغام رسانی کا طریقہ اور اندازِ فہمایش۔ جو تعلیم انھوں نے دی وہ بیحد نرم اور شیریں لہجہ میں ہی جو کچھ کبھار مزدکنا یہ میں کہا، کبھی اسلاف کے کارنامے پیش کر کے غیرت دلائی کبھی یورپ کی کوتاہ اندیشیوں کی طرف اشارہ کردیا۔ کبھی اشک شوئی کے لئے دلیل صبح روشن کی تنک تابی "دلیل صبح روشن ہے ستاروں کی تنک تابی" اکبر بہت بڑھائی کبھی پرانی تہذیب کا واسطہ دیا۔ کبھی آنے والے خطرات سے خبردار کیا۔ غرض ٹوٹے ٹوٹکوں سے اور جھاڑ پھونک سے صدیوں کے بیمار مریض کا علاج سوچا مگر انھیں جلد ہی معلوم ہوگیا کہ مریض کسی طرح سنبھالا لینے کا نام نہیں لیتا اور قرنوں کا سویا ہوا انسان "ودا" کی صداے نرم و ترنم سے جاگتا نظر نہیں آتا۔ اس لئے شعلہ نوائی کی ضرورت ہے چنانچہ اپنے پیغام کی بے اثری کا اظہار یوں اقبال کیا:۔

پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر — مردِ ناداں پر کلامِ نرم و نازک بے اثر

اس اعترافِ شکست کے ساتھ وہ مریض کے عروقِ مردہ میں روح پھونکنے اور قوم کی رگوں میں خونِ حیات دوڑانے کے لئے نئے مرکبات، تلخ دوائیں اور تیز انجکشنوں سے لیس ہوجاتے ہیں اور تجدیدِ حیاتِ ملت کے نسخے کو ایمان و یقین خودداری اور خود پرستی۔ دریوزہ گری کی سفاہت اور علوئے فکر و مقصد کی لامحدودیت و لاانتہائی کے اجزا سے قوی تر بنا کر ایک بار پھر میدانِ عمل میں آجاتے ہیں

لیکن سعی پیہم کو ناکامیاب دیکھکر نہ صرف مردِ ناداں سے انھیں شکایت پیدا ہوتی ہے بلکہ ایزدی تائید کی کمی اور غربت کو دیکھکر وہاں بھی شکوہ کرنے سے نہیں چوکتے ہیں ذرا شکایت کے تیور دیکھو

ترے شیشے میں مے باقی نہیں ہے — بتا کیا تو مرا ساقی نہیں ہے
سمندر سے ملے پیاسے کو شبنم — بخیلی ہے یہ رزاقی نہیں ہے
اگر کج رو ہیں انجم آسماں تیرا ہے یا میرا — مجھے فکرِ جہاں کیوں ہو جہاں تیرا ہے یا میرا

لیکن ان کو اتنی فرصت نہیں کہ شکوہ و شکایت میں زیادہ وقت صرف کریں اسلئے پھر وہ اپنی دھن میں محو ہوجاتے ہیں اور جو علاج انھوں نے تجویز کیا ہے اس کی آزمائش کرتے ہیں۔ وہ مردِ ناداں کو پرِ دبالِ جبرئیل عطا کرتے ہیں تاکہ وہ اپنے مقام اور منتہاے مقصد سے آگاہ ہوجائے اور شاید علو و رفعتِ مقام اس کی تحصیل کی خواہش کو بیدار کردے۔

ان کے نزدیک مردِ مومن کا منتہائے مقصد کشش جہت معلوم میں محدود نہیں ہے اور نہ مقصدِ زندگی صرف اس خاکدان کی تفریحات پر اکتفا کر لینے کا نام ہے بلکہ مسلسل جد و جہد ایک منزلِ لامحدود نامعلوم کے حاصل کرنے کا نام زندگی ہے۔

ہر اک مقام سے آگے مقام ہے تیرا — حیاتِ ذوقِ سفر کے سوا کچھ اور نہیں
اسی روز و شب میں الجھ کر نہ رہ جا — کہ تیرے زمان و مکاں اور بھی ہیں

مردِ مومن کا وطن ممالکِ محدود کا مقصد نہیں ہے بلکہ

نہ چینی و عربی وہ نہ رومی و شامی — سما سکا نہ دو عالم میں مردِ آفاقی
وہی جہاں ہے ترا جس کو تو کرے پیدا — یہ سنگ و خشت نہیں جو تری نگاہ میں ہے

اور اصل تو یہ ہے کہ مومن کے جہاں کی حد نہیں ہے مومن کا مقام ہر کہیں ہے۔

مردِ مومن کی علوِ مراتب اور وسعتِ منزل کے یہ مناظر دکھا کر یہ بھی بتا دیتے ہیں کہ اگر تم یہ چاہتے ہو کہ بغیر ہاتھ پیر ہلائے یہ مدارج نصیب ہو جائیں تو ناممکن ہے اور یہ مراتب اس وقت تک حاصل ہونا بھی دشوار ہیں تا وقتیکہ غلامی اور دریوزہ گری کی لعنت کا طوق گردن سے نکال کر نہ پھینکا جائے اور خودی خودداری اور خود اعتمادی سے کام نہ لیا جائے اور ہر فرد کو اس کی فطری اور دبی ہوئی پوشیدہ قوتوں کا علم نہ ہو جائے اور وہ اپنی انفرادی شخصیت اور اہمیت کو تسلیم نہ کرے اور یہ نہ سمجھ لے کہ یزداں کے بعد اس کا مرتبہ سب کائنات سے بلند اور ارفع ہے،

ذرا خودی پیدا کرنے والے انجکشنوں کا زور دیکھو!۔

جہاں بینی مری فطرت ہے لیکن — کسی جمشید کا ساغر نہیں میں
خودی سے اس طلسمِ رنگ و بو کو توڑ سکتے ہیں — یہی توحید تھی جس کو نہ تو سمجھا نہ میں سمجھا

خودی کی تعریف

خودی کی شوخی و تندی میں کبر و ناز نہیں — جو ناز بھی ہے تو بے لذتِ نیاز نہیں

ظاہر ہے کہ کبر و ناز انسان صرف یزداں کے مقابلے میں مذموم ہے ورنہ محمود

عشقِ بتاں سے ہاتھ اٹھا اپنی خودی میں ڈوب جا — نقش و نگارِ دیر میں خونِ جگر تلف نہیں

خودی کی گہرائی

خودی وہ بحر ہے جس کا کوئی کنارہ نہیں — تو آب جو اسے سمجھا ہے گر تو چارہ نہیں
یہ پیام دے گئی ہے مجھے بادِ صبح گاہی — کہ خودی کے عارفوں کا ہے مقام پادشاہی

انسان کے اندر اگر خودی پندار یعنی اپنی فطری صلاحیتوں کا ادراک باقی نہیں اور اسے اس پر فخر نہیں تو وہ موت کے مترادف ہے

بے ذوقِ نمود زندگی موت — تعمیرِ خودی میں ہے خدائی
رائی زورِ خودی میں پربت — پربت ضعفِ خودی میں رائی

کسے نہیں ہے تمنائے سروری لیکن — خودی کی موت ہو جس میں وہ سروری کیا ہے
نہ ہے ستارے کی گردش نہ بازیِ افلاک — خودی کی موت ہے تیرا زوالِ نعمت و جاہ

یہی خودی جب اپنے معراج کو پہنچ جاتی ہے اس وقت بندہ کا ہر کام خدا کا کام اور خدا کا ہر فعل بندے کے ارادے کا پابند ہو جاتا ہے یہی وہ درجہ ہے جسے تصوف غوثیت اور قطبیت سے تعبیر کرتا ہے۔

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے — خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

اب غلامی کی ہیبتناک تصویریں دیکھو:۔

غلامی کیا ہے، ذوقِ حسن و زیبائی سے محرومی — جسے زیبا کہیں آزاد بندے ہے وہی زیبا
حیات کیا ہے خیال و نظر کی مجذوبی — خودی کی موت ہے اندیشہ ہائے گوناگون

اس کے ساتھ ہی دریوزہ گری کی لعنتیں دکھائی ہیں اور یہ بتایا ہے کہ اپنے بل بوتے پر کھڑا نہ ہونا اور اپنی ترقی کے لئے دوسروں کا دست نگر ہونا انتہائی پست ہمتی اور بزدلی کی دلیل ہے اور اس زندگی کو جو گدائی میں گزرے قابلِ نفرت بتاتے ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ گدائی بے حمیتی اور بے ہمتی پیدا کرتی ہے

اے طائرِ لاہوتی اس رزق سے موت اچھی — جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی
مانگنے والا گدا ہے۔ صدقہ مانگے یا خراج — کوئی مانے یا نہ مانے میر و سلطاں سب گدا

لیکن گداگری سے اسی وقت نجات ممکن ہے جب انسان میں پندار ہو اور پندار یا خودی، شانِ استغنا ہی کو استقامت اسی وقت میسر ہو سکتی ہے جب ضمیر میں عشق و یقین کا مسکن ہو اور مستحکم بنیادوں پر عمارتِ عشق قائم ہو، جنھیں تند سے تند ہوائیں اور خرمن سوز بجلیاں اور عظیم الشان طوفان بھی کوئی صدمہ اور کوئی خلل نہ پہنچا سکیں۔ اقبال کو اسکا یقین ہے کہ مسلم کی تباہی کا بہت بڑا راز اُس کی بے یقینی اور عشق سے بے نصیبی میں مضمر ہے۔

غرضکہ ہر وہ چیز جو سکون کی مخالف ہے صرف بے یقینی کی وجہ سے ہے اسلئے ایقان کی اہمیت ذہن نشین کرتے ہیں:۔

یقین پیدا کر اے ناداں یقیں سے ہاتھ آتی ہے — وہ درویشی کہ جس کے سامنے جھکتی ہے فغفوری
یقیں مثلِ خلیل آتش نشینی — یقین اللہ مستی خود گزینی

اور یقین اور ایمان کا آخری درجہ یہ ہوتا ہے کہ:۔

کافر ہے تو ہے تابعِ تقدیر مسلماں — مومن ہے تو ہے آپ وہ تقدیرِ الٰہی

اور یہ وہ درجہ ہے جو عشق کا مترادف ہے جو فطرتِ انسانی کا مقتضا ہے اور جس کے بعد نفسِ انسان حاکم اور مکان و لامکاں اُس کے تابع ہو جاتے ہیں۔

عشق کے یہ مراتب خود شاعر کی زبان سے سنو:۔

عشق کی مضراب سے ہے نغمۂ تارِ حیات　　　عشق سے نورِ حیات و عشق سے نارِ حیات

عشق ملوک کو مالک بنا دیتا ہے:

جب عشق سکھاتا ہے آدابِ خود آگاہی　　　کھلتے ہیں غلاموں پر اسرارِ شہنشاہی

کائنات کے اندر جو اشیاء بھی اکملیت کا تاج پہن کر آئیں وہ عشق کے در اصل مختلف مظاہر تھے اور ان سے معلوم ہوتا ہے کہ عشق کے مرتبے کتنے اعلیٰ ہیں۔

عشق دمِ جبرئیل عشق دلِ مصطفےٰ　　　عشق خدا کا رسول عشق خدا کا کلام

اب ذرا ان رازوں اور انکشافات کی حقیقت دیکھو جو عشق کی کلید سے کھلتے ہیں۔ وہ یہ بتلاتے ہیں کہ عشق کی قوت کے آگے حکمت و فلسفہ سب پست ہو جاتے اور جو کام عشق سے نکلتے ہیں وہ فلسفہ کے قابو سے باہر ہوتے ہیں عشق مذہب و ملت کی پابندیوں سے انسان کو چھڑا دیتا ہے اور کافر و زندیق کا امتیاز اٹھ جاتا ہے اور جب ایک مرتبہ دولت عشق حاصل ہو جاتی ہے تو پھر اس کے زوال پذیر ہونے کا خارشہ نہیں ہوتا۔

صحبتِ پیرِ روم سے مجھ پہ ہوا یہ راز فاش　　　لاکھ حکیم سر بجیب ایک کلیم سر بکف

اگر ہو عشق تو ہے کفر بھی مسلمانی　　　نہ ہو تو مردِ مسلماں بھی کافر و زندیق

عشق سے پیدا نوائے زندگی میں زیر و بم　　　عشق سے مٹی کی تصویروں میں سوزِ دمبدم

من کی دنیا ہاتھ آتی ہے تو پھر جاتی نہیں　　　تن کی دنیا چھاؤں ہے آتا ہے دھن جاتا ہے دھن

لیکن اس عشق کی آمد، بلا کی آمد ہے، اس کی آمد میں کچھ خسارے ہیں۔ نقد دل، نقد جاں، نقد خرد، ہر شے اس کے لئے قربان کر دینا پڑتی ہے۔ اور اس پر طرہ یہ کہ اس کے انداز آمد بھی نرالے ہیں وہ ایسے لباسوں میں ظاہر ہوتا ہے کہ نگاہ کوتاہ بیں تو اسے پہچان بھی نہیں سکتی، ذرا عشق کی یہ نیرنگیاں دیکھو:-

کبھی آوارہ و بے خانماں عشق　　　کبھی شاہِ شہاں نوشیرواں عشق

کبھی میداں میں آتا ہے زرہ پوش　　　کبھی عریاں و بے تیغ و سناں عشق

گاہ بحیلہ می برد، گاہ بزور می کشد　　　عشق کی ابتدا عجب، عشق کی انتہا عجب

عشق و یقین پیدا کرنے کی تلقین کرنا آسان ہے اور اس کی خوبیاں بیان کر دینا آسان تر لیکن صرف تلقین سے عشق و یقین پیدا ہو جایا کرے تو کیا کہنا، اگر صرف منزل کا نام و نشان اور اس کے سود اور عمارات کی دلچسپ داستانیں راہرو کو بتا دی جائیں تو منزل تک پہنچنے کے لئے غالباً یہ ناکافی ہوگا کیونکہ جب تک راہ کے نشیب و فراز اور منزل کی سمت معلوم ہو۔ سیاح جنگلوں اور بیابانوں میں مارا مارا پھرے گا اور لاتعداد صعوبتیں جھیلے گا۔ جب تک شوق و ذوق دل میں موجزن ہے در بدر تلاش میں ٹھوکریں کھائیگا جب پیہم ناکامیوں سے شوق میں کمی شروع ہوگی۔ قویٰ میں انحطاط شروع ہو جائیگا۔

تو ہار کر کوشش چھوڑ دیگا اس لئے منزل کا پتہ دینے والے کا یہ بھی فرض ہے کہ راہ نمائی کرے اور خضر راہ بنے لیکن اگر یہ نہیں کر سکتا ہے تو کم سے کم وہاں تک پہنچنے کی ترکیب اور راستے کے نشیب و فراز سے بخوبی اُسے آگاہ کر دے اقبال اپنی اس ذمہ داری کو محسوس کرتے ہیں اور منزل عشق و یقین تک رسائی کی تدبیریں بتاتے ہیں اُن کا خیال ہے اور صحیح خیال ہے کہ یقین و عشق کی منزل تک پہنچنے کا راستہ عقل کی پُر پیچ و خار دار مملکت سے ہو کر گزرتا ہے اور یہ وہ وادی ہے کہ جہاں دلائل کے بڑے بڑے عمیق کھڈ شک و شبہہ کے تاریک درے اور وہم کے بحر ذخار بہتے ہیں جہاں زماں و مکاں کیف و کم چوں چرا علت و معلول کی بھول بھلیاں ہیں جن کے اندر ایک مرتبہ انسان داخل ہوا تو شاذ و نادر ہی نکل سکتا ہے، اُس مملکت میں اتنی رنگینیاں ہیں اور دل بہلانے کے اتنے سامان ہیں کہ منزل کے کیف و سرور کی یاد بھلا دیتے ہیں اور انسان اس میں پڑ کر اُسی سرزمین کو اپنی منزل سمجھنے لگتا ہے لیکن جب مناظر کی یک رنگی اکی سطاحت، بے ثباتی اور روح کی بیقراری اور اس کے "ہل من مزید" کا جواب دینے سے عجز نگاہوں کے سامنے آجاتا ہے تو انسان بددل ہو جاتا ہے اور پھر خواہش منزل دل میں گدگدی پیدا کرنے لگتی ہے اور وہ یہ سمجھنے لگتا ہے کہ یہ منزل نہیں ہے بلکہ نظری دھوکا ہے لیکن احساس کے پیدا ہونے میں اتنی مدت لگ جاتی ہے کہ اس کا زادِ راہ ختم ہو چکتا ہے اُس کے قویٰ کی بنیادیں ہل چکی ہوتی ہیں اور اُس کا سرمایۂ حیات بھی ختم ہوتا ہے اور اس کے حوصلے پست ہو جاتے ہیں اور ناشاد و نامراد، دل شکستہ و رنجور ایک فنا کے بحر مواج میں ایسا ڈوب جاتا ہے کہ ابھی تک نہیں اُٹھتیں

اقبال کے پیش نظر یہ تمام مناظر ہیں۔ اس لئے وہ یقین و عشق کے سالکین کو ان خطرات سے آگاہ کرتے ہیں اور خضرِ راہ بن کر یہ بتاتے ہیں کہ یقین تک پہنچنے کے لئے ہر چند کوئی کہے کہ راہ عقل اختیار کرو نہ مانو۔ وہ راہ منزل نہیں ہے بلکہ

"ایں رہ کہ توی روی بترکستاں است"

یقین تک پہنچنے کا راستہ بالکل عقل و خرد کی مخالف صف میں جاتا ہے اپنا عقل و خرد کی راہ چھوڑ دو اور منٹوں میں منزل مقصود کو پہنچ جاؤ گے دیکھو یہ خدمت شاعر اپنے مخصوص انداز میں کیونکر ادا کرتا ہے۔

خرد کے پاس خبر کے سوا کچھ اور نہیں — ترا علاج نظر کے سوا کچھ اور نہیں

خرد واقف نہیں ہے نیک و بد سے — بڑھی جاتی ہے ظالم اپنی حد سے

خرد اور علم سے جو تجربات حاصل کئے انکی تلخیاں دیکھو۔ خرد اور علم صرف فلسفہ اور حکمت سے باخبر کرتے ہیں۔ لیکن اُن کی دستگیری سے خدا نہیں ملتا

اُٹھا میں مدرسہ و خانقاہ سے غمناک — نہ زندگی، نہ محبت نہ معرفت نہ نگاہ

اس لئے کہ دلائل و براہین کا جہاں گزر ہوگا۔ وہاں زندگی کی محبت اور نگاہ کی معصومیت ختم ہو جاتی ہے ۔

خرد نے مجھ کو عطا کی نظر حکیمانہ — سکھائی عشق نے مجھ کو حدیث رندانہ

عقل عیار ہے سو بھیس بنا لیتی ہے   عشق بیچارہ نہ مُلا ہے نہ زاہد نہ حکیم

آخر میں یہ دیکھ کر یہ ذوقِ نظر بے تائید سماوی کے پیدا نہیں ہو سکتا۔ دعا کرتے ہیں

خرد کی گتھیاں سلجھا چکا میں   مِرے مولا مجھے صاحبِ جنوں کر

لیکن وہ صرف دعا کے قائل نہیں ہیں اور جانتے ہیں کہ ایقان و ایمان یا بالفاظ دیگر عشق کے لئے عمل و سعی کی بھی ضرورت ہے اور عمل نام ہے تن آسانی اور تن پروری کو خیرباد کہنے کا جفاکشی اور جفاطلبی سے ہم آہنگ ہونے کا شخصی اعتماد اور راسخ عزم و ہمت کو کام میں لانے کا اور "سخت کوشی" کو معیار بنانے کا۔ چنانچہ اس سخت کوشی کی اہمیت یوں ذہن نشین کرائی جاتی ہے:-

ہے شباب اپنے لہو کی آگ میں جلنے کا نام   سخت کوشی سے ہے تلخِ زندگانی انگبیں

نہیں تیرا نشیمن قصرِ سلطانی کے گنبد پر   تو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں میں

گزر اوقات کر لیتا ہے یہ کوہ و بیاباں میں   کہ شاہیں کے لئے ذلت ہے کارِ آشیاں بندی

برہنہ سر ہے تو عزمِ بلند پیدا کر   یہاں فقط سرِ شاہیں کے واسطے ہے کلاہ

سکون، جمود اور تقلید بیجا ہے اور ان سے سوائے ذلت کے اور کچھ حاصل نہیں ہوتا۔

فریبِ نظر ہے سکون و ثبات   تڑپتا ہے ہر ذرّہ کائنات

سمجھتا ہے تو راز ہے زندگی   فقط ذوقِ پرواز ہے زندگی

پیامِ اقبال کی دوسری منزل کے یہ چند نمونے تھے جو پیش کئے گئے اور غالباً ان سے یہ نتیجہ نکالنا مشکل نہیں کہ شیرینیِ تکلم کے ساتھ کرختگی انداز کی شوریت بھی آہستہ آہستہ بڑھتی جا رہی ہے اور "نوا را تلخ تر می زن چو ذوقِ نغمہ کم یابی" کی اشعار متذکرۂ بالا کے ذریعہ ایک صحیح تصویر سامنے آجاتی ہے

غالباً اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جو انجکشن انھوں نے قوم کی عروقِ مردہ میں خونِ حیات دوڑانے کے لئے اور قلوبِ مردہ میں تحریکِ حیات پیدا کرنے کے لئے تجویز کئے وہ کتنے مناسب اور برمحل تھے جو تعلیم وہ پیش کرتے ہیں وہ کس قدر ضروری اور حیاتِ قوم کے لئے کتنی بیش بہا ہے انھیں کتنا صحیح درک ہے کہ قوم کے اندر جب تک غلامی اسیری فقدانِ عمل۔ بے حمیتی۔ کوتہ نظری عشق سے بے بہرگی اور یقین کی کمزوری کے جراثیم نشوونما پاتے رہیں گے اور ان کے استیصال اور فنا کی فکر نہ کی جائیگی۔ ترقی نا ممکن ہی نہیں بلکہ محال ہے اور قوم کے پنپنے کی امید تو دور جینے کے لالے پڑ جائینگے یہ تمام صورتیں ذہن میں رکھ کر انھوں نے مرض کی دوا تجویز کی اور صحیح دوا تجویز کی۔

لیکن ان کی دور رس نگاہیں اور تجربہ کار نظریں اس خطرے کو بھی دیکھتی ہیں جو دورانِ علاج میں بے اعتدالی اور بدپرہیزی سے پیدا ہو سکتا ہے وہ دیکھتے ہیں کہ بدپرہیزی کے اسباب اور اس پر رغبت دلانے والے قرائن کی بازار میں اسقدر کثرت ہے کہ ان سے مفر نہیں اس لئے وہ ان کے عیوب اور ان کے نقصانات کو برسرِ بازار بیان کرنا شروع

کردیتے ہیں تاکہ حرص افزا ساماں کی ماہیت اور اصلیت دیکھ کر طبیعتیں کھٹی ہو جائیں اور انکی طرف متوجہ نہ ہوں۔
یہیں سے ان کے پیغام میں ایک نیا رنگ پیدا ہو جاتا ہے ان کا پیغام دورِ حاضرہ کی ہر اس شے کے تجزیہ تحلیل اور تشریح سے پُر ہے جو نظر فریب اور دل آویز ہے
ایشیا کے تصوف نے اور یورپ کی مادہ پرستی اور سائنس کی روز افزوں ترقی نے جو مایا کا جال بچھا رکھا ہے۔ زنگ کے آئین و رسوم اور ملا کے عقائد نے جو ڈھونگ بنائے ہیں ان کا پول کھولنا ان کے فلسفہ اور عقل کی تگ و دو سے جو انکشافات ہوئے اُن کے اسرار کو نمایاں کرنا پیامِ اقبال کے نئے دور کی امتیازی خصوصیات ہیں۔
اور چونکہ ان سامریوں کے باندھے ہوئے طلسموں کی کشاد کے لئے معمولی افسوں و منتر کارآمد نہیں ہو سکتے اس لئے شاعر اس طلسم کی کشاد کے لئے قوت کلیم سے کام لے کر **ضرب کلیم** لگاتا ہے اور طلسمات اور عجائبات کے تار و پود بکھیر ڈالتا ہے۔
آؤ دیکھیں کہ طلسمات کی فتح کیا کیا عجائبات دکھاتی ہے اور ان کی حقیقت کیا ہے
سب سے پہلے شاعر ایشیا کے ان اصنام کو سرنگوں کرتا ہے جو ترقی میں حارج ہیں جن کی قدامت بڑی حد تک پستی اور تنزلی کی ضامن ہے شاعر ان کے استیصال کی فکر کرتا ہے
ایشیائی تصوف میں تن بتقدیر رہنے کا مسئلہ سب سے زیادہ حل ہوتا ہے۔ ہاتھ پیر کاٹ کر بیٹھ جانا اور تقدیر کا لکھا کہہ کر کام کرنا عین عبادت ہے۔ آجکل بیشتر علما کے گروہ صرف اس وجہ سے تلقینِ دین اور تبلیغ دین کو بُرا سمجھتے ہیں کہ قربِ قیامت کی دلیل ہے کہ انحطاط دین ہو لہٰذا اُس کا علاج غیر ممکن ہے اس تباہ کن اصول نے جس طرح قوم کو تباہ کیا وہ عیاں ہے شاعر اس مرض سے واقف ہے اور اس کا ذکر کر کے توجہ منعطف کرتا ہے

تن بہ تقدیر ہے آج اُن کے عمل کا انداز ۔۔۔ تھی نہاں جن کے ارادوں میں خدا کی تقدیر
تھا جو ناخوب بتدریج وہی خوب ہوا ۔۔۔ کہ غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر

تصوف جو ایک جماعت کا اوڑھنا بچھونا ہو رہا ہے اپنی علومزنگی اور حقیقت طلبی کے عجب پندار میں گرفتار ہو درآنحالیکہ وہ حقیقت سے کوسوں دُور ہیں اقبال ایک میزان قائم کر کے بتاتے ہیں کہ کون تصوف حقیقت میں تصوف کہے جانیکے قابل ہے

یہ حکمتِ ملکوتی یہ علم لاہوتی ۔۔۔ حرم کے درد کا درماں نہیں تو کچھ بھی نہیں
یہ ذکرِ نیم شبی یہ مراقبے یہ سرور ۔۔۔ ترے خودی کے نگہباں نہیں تو کچھ بھی نہیں

در اصل مجاہدانہ زندگی عین عرفان ہے:-

مجاہدانہ حرارت رہی نہ صوفی میں ۔۔۔ بہانہ بے عملی کا بنی شراب الست

ہر شخص مومن ہونے کا دعویدار ہے لیکن شاعر صدف اور خزف کا فرق بتاتا ہے۔

کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے — مومن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہیں آفاق

ذرا مومن کا دبدبہ اور صولت دیکھو اور ہمت مردانہ کا نظارہ کرو

افلاک سے ہے اس کی حریفانہ کشاکش — خاکی ہے مگر خاک سے آزاد ہے مومن

جچتے نہیں کنجشک و حمام اس کی نظر میں — جبرئیل و سرافیل کا صیاد ہے مومن

تصوّف اور صوفی کے جھگڑے فیصل کرکے آگے بڑھتے ہیں تو تعلیم و تربیت کے صنم سے دوچار ہوتے ہیں اس کے عیوب دکھا کر صحیح تعلیم و تربیت کے خاکے بنا کر پیش کرتے ہیں

وہ تعلیم کس قدر بے سود ہے کہ جس سے کوئی صورتِ انتفاع نہ نکلے۔

اپنی حکمت کے خم و پیچ میں ایسا اُلجھا — آج تک فیصلۂ نفع و ضرر کر نہ سکا

سائنس کے اکتسابات نے ارض و سما کو مقید و محکوم بنا لیا لیکن یہ واقعہ ہے کہ انسانی زندگی کی مسرتوں میں ایک شمّہ برابر بھی اضافہ نہیں ہوا بلکہ بنی نوعِ انسان کے لئے مادی ترقیاں ہر روز سوہان روح کا باعث بن رہی ہیں:۔

جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا — زندگی کی شبِ تاریک سحر کر نہ سکا

محکومی اور غلامی دماغی ترقی میں حارج ہوتی ہے اور اس کے اکتسابات بجز چند لایعنی علوم اور فنون کے اور کچھ نہیں ہوتے جن کا مقصد بجز تفنن اور تضیعِ اوقات کے اور کچھ نہیں ہوتا ہے محکومی دماغ کی ان صعوبتوں کو فنا کرنے پر تلی رہتی ہے جو عالی حوصلگی آزادی، علو فکر اور ایجاد و اختراع کی ضامن ہوتی ہیں اقبال اس کو محسوس کرتے ہیں۔

آزاد کا اندیشہ حقیقت سے منور — محکوم کا اندیشہ گرفتارِ خرافات

محکوم کے حق میں ہے یہی تربیت اچھی — موسیقی و صورت گری و علم نباتات

انھیں طالب علم کے کرم کتابی ہونے کا افسوس ہے اور طالب علم کو "چار پائے بر او کتابے چند" کا مصداق دیکھنا پسند نہیں وہ یہ چاہتے ہیں طالب علم کا علم اس حد تک پہنچ جائے جہاں خود وہ قابل تقلید ہو جائے وہ اپنے لئے ایک نئی شاہراہ نکالے اور اس میں فطرتی انداز پیدا ہو جائے:۔

تجھے کتاب سے ممکن نہیں فراغ کہ تو — کتاب خواں ہے مگر صاحبِ کتاب نہیں

خدا تجھے کسی طوفان سے آشنا کر دے — کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں

استاد اور معلم سے بھی وہ دو دو باتیں کرتے چلتے ہیں اور ان کو بتلاتے ہیں کہ پرانی ہڈیوں کو چوسنا اور وہی شاگردوں کے آگے ڈالنا بیکار ہے ضرب زیدٌ عمراً کو بار بار دہرانا سراسر حمق ہے جو تمھارے پاس علم سیکھنے آئے ہیں انھیں یہ بتاؤ کہ وہ زمانہ کے ساتھ کیونکر چلیں۔ اور تنگ نظری اور بحث و مباحثہ کے چند فرسودہ اصول و ضوابط کو رٹنے اور دہرانے کے بجائے کارزار ہستی میں دوسروں کے دوش بدوش کس طرح رہ کر اپنی زندگی کا ثبوت دیں:۔

مقصد ہے اگر تربیتِ لعلِ بدخشاں   بے سود ہے بھٹکے ہوئے خورشید کا پرتو

دنیا ہے روایات کے پردے میں گرفتار   کیا مدرسہ کیا مدرسے والوں کی تگ و دو

کر سکتے تھے جو اپنے زمانے کی امامت   وہ کہنہ دماغ اپنے زمانے کے ہیں پیرو

اور صاف صاف بتا دیتے ہیں کہ اس تعلیم کی حقیقت کیا ہے جو تم دوسروں کو دے رہے ہو:۔

اور یہ اہلِ کلیسا کا نظامِ تعلیم   ایک سازش ہے فقط دین و مروت کے خلاف

وہ یہ بھی بتا دیتے ہیں کہ تعلیم کیا ہے اور نوجوانوں کو کس قسم کی تعلیم کی ضرورت ہے۔

خودی کی پرورش و تربیت پہ ہے موقوف   کہ مشتِ خاک میں پیدا ہو آتشِ سوزاں

مدرسہ کی قال و قیل اور خانقاہ کی ہائے ہو سے آگے بڑھتے ہیں تو ان کو اسی دورِ حاضرہ کا تراشیدہ اور یورپ کا سنوارا ایک دوسرا بت کرسی نشیں نظر آتا ہے۔ یہ "زن پرستی" کا بت ہے وہ اس بت کے بھی اصلی خط و خال یدِ بیضا کی روشنی میں چمکا دیتے ہیں وہ یورپ کی اندھا دھند تقلید کرنے والوں پردے کو خیرباد کہنے والوں اور بیباکیِ نسواں کے حامیوں کی نگاہوں سے یوں پردے اٹھاتے ہیں:۔

رسوا کیا اس دور کو جلوت کی ہوس نے   روشن ہے نگہ آئینۂ دل ہے مکدّر

بڑھ جاتا ہے جب ذوقِ نظر اپنی حدوں سے   ہو جاتے ہیں افکار پراگندہ و ابتر

نے پردہ نہ تعلیم نئی ہو کہ پرانی   نسوانیتِ زن کا نگہباں ہے فقط مرد

شاعر اس نقاب کی دنیا سے گزر کر ادب اور فنونِ لطیفہ کے سحرستان میں داخل ہوتا ہے تو ایک نیا عالم دیکھتا ہے ہر چیز دلکش، دلفریب، ایمان شکن اور مسحور کن نظر آتی ہے۔ لیکن طلسم کشا فتح و ظفر کے ساتھ ان سیمیاوی مناظر کی حقیقت کو بے نقاب کر دیتا ہے تاکہ ان کا سحر زائل ہو جائے

الگ الگ ہر پیکر اور مرقع کی حقیقت دیکھو:۔

وہ پیرس کی مسجد دیکھتا ہے تو اسے یہ صاف صاف نظر آتا ہے کہ یہ توحید پرستی کی نمائش گاہ نہیں بلکہ اس کی تعمیر میں بھی ابلہ فریبیاں ہیں اور اس کا کوئی تعلق اسلامی ہمدردی یا اخوت سے نہیں ورنہ دمشق کی تباہی کا درد آج ہمیں سمجھنا نہ پڑتا۔ لہٰذا یہ دیکھ کر کہ پیرس میں مسجد تعمیر ہوگی اچھلنا کودنا بیکار ہے کیونکہ استبداد کا دیوتا وہاں بھی موجود ہے۔

حرم نہیں ہے یہ فرنگی کرشمہ سازوں نے   تنِ حرم میں چھپا دی ہے روحِ بتخانہ

یہ بت کدہ انھیں غارت گروں کی ہے تعمیر   دمشق ہاتھ سے جن کے ہوا ہے ویرانہ

تھیٹر کے پاس سے گزرتا ہے تو ان کو محسوس ہوتا ہے کہ سراپا نقالی اور تصنع ہے اور دوسرے کے اقوال و افعال کی تصویر اتارنا درآنحالیکہ خود جذبات نہ ہوں نری بے حسی اور بے غیرتی ہے جو سرور و کیف ان تمثیلوں سے حاصل

ہوتا ہے وہ بے بنیاد ہے اس لیے کہ سرور و کیف تو وہی سچا ہے جو انسان کے اپنے جوہر اور کمالات سے حاصل ہوا ہو نہ کہ دوسروں کے حرکات سکے تتبع اور نقالی سے

تری خودی سے ہے روشن ترا حریم وجود
حیات کیا ہے اسی کا سرور و سوز و ثبات

حریم تیرا، خودی غیر کی! معاذ اللہ
دوبارہ زندہ نہ کر کاروبار لات و منات

انھیں سینما کے پردوں پر گمان ہوتا ہے کہ وہ آزری کا طریقہ ہے چند حسین اور نازک جسموں کے بتوں کے درشن اور ان کے حرکات کی تعریف و توصیف کے لئے پیسے خرچ کئے جاتے ہیں۔ اور پھر اثرات مابعد ان کی پرستش کی صورت میں نظر آتے ہیں اس لئے بت فروشی بت گری اور بت پرستی کی پرانی رسمیں نئے لباسوں میں جلوہ گر ہیں۔

وہی بت فروشی وہی بت گری ہے
سینما ہے یا صنعتِ آزری ہے

وہ مذہب تھا اقوام عہدِ کہن کا
یہ تہذیب حاضر کی جلوہ گری ہے

وہ دنیا کی مٹی یہ دوزخ کی مٹی
وہ بت خانہ خاکی یہ خاکستری ہے

ہر شخص فنونِ لطیفہ کا دلدادہ ہے اگر صحیح ذوق اور نظر دقیق کم ہی لوگ رکھتے ہیں لیکن دعوے بصیرت سب کو ہوتا ہے اور فنونِ لطیفہ کی حقیقت کیا ہے یہ بھی کم نظریں دیکھ سکتی ہیں۔

چنانچہ اقبال اس نظریہ پر کاربند ہیں کہ فنونِ لطیفہ اگر احساسات اور جذبات میں انفعالیت نہیں پیدا کرتے روح میں بیداری کی لہر نہیں دوڑاتے تو بیکار محض ہیں

اے اہلِ نظر ذوقِ نظر خوب ہے لیکن
جو شے کی حقیقت کو نہ دیکھے وہ نظر کیا

شاعر کی نوا ہو کہ مغنی کا نفس ہو
جس سے چمن افسردہ ہو وہ بادِ سحر کیا

اقبال کو مصور سے بھی تعرض ہے اور بجا تعرض ہے اول تو انھیں یہ اعتراض ہے کہ تقلیدِ فرنگ نامناسب ہے اپنے نقش و رنگ کیوں چھوڑو تمھارا آرٹ خود بہترین تمھارا تخیل خود بہت بلند پرواز ہے اس لیے کیوں نہ اسے بلندیوں تک پہنچاؤ۔ دوسرا اعتراض یہ ہے کہ ہر شے کی فطرت اور نیچر کے صحیح سے صحیح نمونے پیش کرنیکا تمھیں ذوق ہے اور سعی کرتے ہو لیکن کبھی یہ کوشش نہیں کرتے کہ اپنی خودی کو سربازار لاؤ اس کے جوہر دکھاؤ اور اسے شکل میں نمایاں کرنے کی کوشش کرو اور اسکے جلوہ گر ہوتے ہی تمام عیوب، اور ہر طرح کا تنزل اور ادبار آناً فاناً ختم ہو جائے گا

وہ فوارے کو دیکھتے ہیں تو فوراً ان کے دل میں خیال گذرتا ہے کہ فوارہ بھی جوش دروں رکھتا ہے اور اسکا اظہار کرتا ہے

اُدھر نہ دیکھ اِدھر دیکھ اے جوانِ عزیز
بلند زورِ دروں سے ہوا ہے فوارہ

انھیں موسیقی سے بھی لاگ ہے اور اسے بھی قابل اعتنا نہیں سمجھتے اس لئے کہ:-

وہ نغمہ سردیِ خونِ غزل سرا کی دلیل
کہ جس کو سن کے ترا چہرہ تابناک نہیں

پھرا میں مشرق و مغرب کے لالہ زاروں میں — کسی چمن میں گریباں لالہ چاک نہیں

دورِ حاضر کی ایک دوسری لعنت رقص ہے جو شہوانی کے لئے اشتعال انگیز ہے اقبال اس رقص کے قائل ہیں جو روح کو وجد میں لائے اور جس کا وجود عین قوت اور عظمت کی دلیل ہے

چھوڑ یورپ کے لئے رقص بدن کے خم و پیچ — روح کے رقص میں ہے ضرب کلیم اللّٰہی
صلہ اس رقص کا ہے تشنگیٔ کام و دہن — صلہ اس رقص کا درویشی و شاہنشہی

شاعرانِ لطیف اور بہ ظاہر مسحور کن نظاروں کی پردہ دری کرکے آگے بڑھتا ہے تو زمانے کے سب سے بڑے ہبل سے دوچار ہوتا ہے جو تمام دنیا پر چھایا ہوا ہے جس کے ظلم و استبداد جبل و فریب۔ شیدہ فن نے تمام دنیا میں ہلچل ڈال رکھی ہے جس کے بے آئین طرز حکومت کے باعث تمام دنیا عیش و سکون سے عاری محروم ہوگئی ہے۔

شاعر اپنی تمام قوتوں کو ایک مرکز پر جمع کرکے اس "دیو" کی انانیت توڑنے کے لئے آگے بڑھتا ہے اور ضرب کلیمی سے اس کے پرخچے اڑا دیتا ہے۔ اس دیو کے بکھیرے ہوئے تار پود دیکھو

سیاستِ افرنگ۔ یورپی اقوام نے سیاست کی جو داغ و بیل ڈالی اور جس طرف وہ اپنے پُر فریب چالوں سے دنیا کے مختلف طبقوں کو سبز باغ دکھا کر رفتہ رفتہ اپنے دام میں لا رہے ہیں وہ ابلیسیت کا عین جواب ہے

تری حریف ہے یا رب سیاستِ افرنگ — مگر ہیں اس کے پجاری فقط امیر و رئیس
بنایا ایک ہی ابلیس آگ سے تو نے — بنائے خاک سے اسنے دو صد ہزار ابلیس

دنیا آج جمہوریت کو نہ جانے کس قدر عزیز اور بیش قیمت شے جانتی ہے حالانکہ موجودہ زمانے کا نظامِ جمہوریت کہیں سے جمہور کی آرا سے تشکیل نہیں ہوتا اور نہ جمہور کی در اصل کوئی آواز ہوتی ہے بلکہ جمہوریت کے پردے میں شخصی اور انفرادی استبداد اور مطلق العنانی چھپی ہوئی

اس راز کو اس مردِ فرنگی نے کیا فاش — ہرچند کہ دانا اسے کھولا نہیں کرتے
جمہوریت اک طرزِ حکومت ہے کہ جس میں — بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے

جمعیت اقوام کا جو ڈھونگ چند یورپی اقوام نے رچا رکھا ہے اور جس کی قوت و عظمت اور کار آمد ہونے کا ثبوت متعدد بار دنیا کو مل چکا ہے اقبال نے کسی موقعہ پر اس کی طرف "کفن دزدے چند" کہہ کر اشارہ کیا تھا اُس وقت اس کی حقیقت یوں کھولتے ہیں۔

بیچاری کئی روز سے دم توڑ رہی ہے — ڈر ہے خبرِ بد نہ مرے منہ سے نکل جائے
ممکن ہے کہ یہ داشتۂ پیرکِ افرنگ — ابلیس کے تعویذ سے کچھ روز سنبھل جائے

اشتراکیت یا روسی ہوا کا راز بھی سنو۔

قوموں کی روش سے مجھے ہوتا ہے یہ معلوم　　بے سود نہیں روس کی یہ گرمیٔ رفتار
اندیشہ ہوا شوخیٔ افکار پہ مجبور　　فرسودہ طریقوں سے زیادہ ہوا بیزار
انساں کی ہوس نے جنہیں رکھا تھا چھپا کر　　کھلتے نظر آتے ہیں بتدریج وہ اسرار

یورپ کی یہود نواز پالیسی جس نے مغرب اقصٰی میں ہلچل مچادی ہے اُس کی حقیقت کیا ہے:-

یہ عیش فراواں یہ حکومت یہ تجارت　　دل سینۂ بے نور میں محروم تسلی
تاریک ہے افرنگ مشینوں کے دھوئیں سے　　یہ وادیٔ ایمن نہیں شایانِ تجلی
ہے نزع کی حالت میں یہ تہذیب جوانمرگ　　شاید ہوں کلیسا کے یہودی متولی

یورپ کے خدایان حل وعقد ہر بیمار اور نادار اور غیر مہذب ملک کے افلاس اور مرض کے دور کرنے کے لئے صرف نسخہ تجویز فرماتے ہیں اور انتداب کا پلاسٹر ہے جسے وہ جا اور بیجا ہر جگہ استعمال کرتے ہیں۔ مگر در اصل اس کا منشا مریض کو جلد از جلد ہلاک کر کے اس کے مال ومتاع کو علاج کے صرفے کے ضمن میں قرق کر لینا ہے

کہاں فرشتۂ تہذیب کی ضرورت ہے　　نہیں زمانۂ حاضر کو اُس میں دشواری
جہاں قمار نہیں، زن تنک لباس نہیں　　جہاں حرام بتاتے ہیں شغل مے خواری
نظر وران فرنگی کا ہے یہی فتویٰ　　وہ سرزمین مدنیت سے ہے ابھی عاری

مغرب باوجود اپنی تمام ترقیوں کے مریض ہے اور مشرق سے کسی حیثیت سے بھی اسے فوقیت حاصل نہیں اور نہ اسے حق حاصل ہے کہ وہ مشرق کی رنجوری کا مداوا کرے درانحالیکہ اُس کی حالت خود زار و نزار ہو

یہاں مرض کا سبب ہے غلامی و تقلید　　وہاں مرض کا سبب ہے نظام جمہوری
نہ مشرق اس سے بَری ہے نہ مغرب اس سے بَری　　جہاں میں عام ہے قلب و نظر کی رنجوری

آج دنیا مسولینی کو جابر اور ظالم کہتی ہے لیکن مسولینی کا جرم نیا ہی نہیں ہر صاحب طاقت نے کمزوروں پر ظلم ڈھائے مصر، شمالی، افریقہ، عرب، ہندوستان، کون اس ظلم سے بچا ہے یورپ کے ممالک کا ہمیشہ یہی مسلک رہا

کیا زمانے سے نرالا ہے مسولینی کا جرم　　بے محل بگڑا ہے معصومان یورپ کا مزاج
میرے سودائے ملوکیت کو ٹھکراتے ہو تم　　تم نے کیا توڑے نہیں کمزور قوموں کے زجاج
پردۂ تہذیب میں غارت گری آدم کشی　　کل روا رکھی تھی تم نے میں روا رکھتا ہوں آج

ہندوستان کے من وسلوا کی طرح ملنے والی اصلاحات کی شان اور دس سال کے بعد ملنے والی قسط عطایا کی حقیقت ملاحظہ ہو:-

یہ مہر ہے بے مہریٔ صیاد کا پردہ　　آئی نہ مرے کام مری تازہ صفیری

رکھنے لگا مرجھائے ہوئے پھول قفس میں — شاید کہ اسیروں کو گوارا ہو اسیری

یورپ کی احسان نوازی اور محسن پرستی کا انداز دیکھو اس سے اس کے نفس فطرت کا پتہ ملتا ہے وہی سویا جہاں عیسائیت کا پیغمبر پیام صلح و آشتی لے کر نمودار ہوا اور جس کے فیض سے آج یورپ سرسبز ہو رہا ہے اور جس سے انتساب کو وہ اپنے لئے قابل ذلت سمجھتا ہے اسی سرزمین کو یورپ نے کیا کیا تحائف عنایت کئے ہیں

فرنگیوں کو عطا خاکِ سوریا نے کیا — نبیٔ عفت و غمخواری و کم آزاری
صلہ فرنگ سے آیا ہے سوریا کے لیے — مے و قمار و ہجومِ زنانِ بازاری

پیامِ اقبال کے یہ وہ نقوش ہیں جو تلخ حقیقتوں سے لبریز ہیں۔ ان نقوش سے پتہ چلتا ہے کہ اقبال اپنے پیہم صلائے عام کے بے اثر ہونے اور لبیک سے محروم رہنے کے باعث اسے تلخ سے تلخ نغموں کی صورتوں میں ادا کرتے ہیں اس خیال سے کہ شاید حقیقت کی بے نقابی جذبات کے اندر صلاحیتِ حیات پیدا کر دے اور شاعر کی محنتیں ٹھکانے لگیں اور اسی وجہ سے وہ اپنے پیغام کو "دورِ حاضرہ سے جنگ" سے موسوم کرتے ہیں۔ اور اپنی آتش بجنشی کی وجہ بتاتے ہیں

بڑا کریم ہے اقبالِ بے نوا لیکن
عطائے شعلہ شرر کے سوا کچھ اور نہیں

زندگی

ترجمہ
از صہبا لکھنوی

اقبالؔ

شبے زار نالید ابرِ بہار
کہ ایں زندگی گریۂ پیہم است
درخشید برق سبک سیر و گفت
خطا کردہ، خندۂ یک دم است
ندانم بہ گلشن کہ برد ایں خبر
سخنہا میانِ گل و شبنم است
(ماخوذ از پیامِ مشرق)

ترجمہ

رات رو رو کے کہتا تھا بادل
آنسوؤں کی جھڑی ہے زندگی آہ!
بولی بجلی چمک کے ہے یہ غلط،
اک ذری سی ہنسی ہے زندگی واہ!
پہنچی گلشن میں یہ خبر کیسے
شبنم و گل میں چھڑ گئی ناگاہ!

اقبال علیہ الرحمتہ

جناب اختر عرفانی صاحب

ڈاکٹر سر محمد اقبال ۱۸۷۳ء میں بمقام سیالکوٹ پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اسکاٹ مشن اسکول میں ہوئی ایف اے تک مرے کالج میں پڑھا۔ شمس العلما سید میر حسن سے فارسی میں بہت کافی فیض حاصل کیا۔ ۱۸۹۷ء میں گورنمنٹ کالج لاہور سے بی۔ اے کیا اور ۱۸۹۹ء میں ایم۔ اے پاس کر لیا۔ پروفیسر آرنلڈ کی صحبتیں اٹھانے سے اقبال میں فلسفہ کا اچھا خاصا مذاق پیدا ہو گیا تھا۔ تعلیم کی تکمیل کے بعد ڈاکٹر اقبال گورنمنٹ کالج ہی میں لکچرار ہو گئے ۱۹۰۵ء میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے انگلستان گئے اور کیمبرج یونیورسٹی میں ڈاکٹر میک ٹیگرٹ، براؤن، ساولجی، اور نکلسن سے فیض اٹھاتے رہے جو اقبال کے شاندار مستقبل کو خوب پہچان گئے۔

شاعری کی ابتدا کالج ہی کی زندگی میں ہو گئی تھی۔ ڈاکٹر اقبال کو رسمی تلمذ حضرت داغ سے حاصل تھا لیکن مقامی مشاعروں اور کالج کے جلسوں میں جب غزلیں اور نظمیں انھوں نے سنائیں تو انھوں نے صاف بتا دیا کہ اقبال کو کسی استاد کی ضرورت نہیں۔ اس کے بعد آپ کی نظمیں انجمن حمایت اسلام کے جلسوں میں سنی گئیں "کوہ ہمالہ"، "نالۂ یتیم"، "ترانۂ ہندی"، "نیا شوالہ"، "حقیقت حسن"، اور "اختر صبح" ان میں سے خاص خاص ہیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب اقبال کا تخیل پر تول رہا تھا اور مشق کا دور تھا۔ اس دور میں اقبال نے پرانے زمانے کے مذاق کی تقلید کے ساتھ ساتھ نئی وضع کی بنیاد بھی رکھی۔ زبان صاف ہو رہی تھی اور خیالات مختلف میدانوں کی طرف دوڑ رہے تھے استواری ابھی پیدا نہ ہو سکی تھی۔ شروع شروع میں ڈاکٹر اقبال اپنا کلام تحت اللفظ پڑھ کر سنایا کرتے تھے۔ لیکن بعد میں بعض احباب کے اصرار پر ترنم سے سنانا شروع کر دیا چونکہ آواز بلند تھی اور لہجہ شیریں تھا اس لئے خواص کے علاوہ عوام بھی آپ کے کلام سے محظوظ ہونے لگے اور بہت جلد اقبال سے مانوس ہو گئے جب بھی انجمن حمایت اسلام کے جلسہ میں ڈاکٹر صاحب کے آنے کی خبر ہوئی تو لوگ جوق جوق جمع ہوتے اور جلسہ میں ایک گرمی، ایک تیور، ایک کس بل پیدا ہو جاتا اور ہر شخص کی زبان پر ہوتا "آج ڈاکٹر اقبال نے آنا ہے" ڈاکٹر صاحب کا نام، ان کی شخصیت، سرخ چہرہ، سنہری مونچھیں، سرخ ترکی ٹوپی اور سیاہ کوٹ پھر ان کا پرکیف ترنم کے ساتھ نظمیں سنانا لوگوں پر خاص اثر رکھتا تھا۔ اقبال عام طور پر جلسوں اور مجلسوں میں شرکت کرنے سے احتراز کرتے تھے۔ مشاعروں میں جانے سے انکار کر دیتے تھے۔ اپنی شخصیت اور شہرت سے بیجا فائدہ اٹھانے سے بہت اجتناب کرتے تھے ۱۹۱۸ء کا ذکر ہے۔ انجمن حمایت اسلام کے سالانہ اجلاس میں اقبال نے کچھ نظمیں سنائیں۔

حضرت سالک (مدیر انقلاب) موجود تھے۔ انھوں نے بیٹھے بیٹھے نقل کر لیں۔ حضرت تاج کا "کہکشاں" جاری تھا ایک نظم سالک نے "کہکشاں" میں شایع کر دی۔ اور یہ بھی لکھ دیا کہ آیندہ بھی "کہکشاں" میں حضرت اقبال کا کلام شائع ہوتا رہیگا۔ دوسرے ہی دن اقبال کا ایک نوٹس تاج کے نام پہونچا جسمیں اقبال نے لکھا کہ "میں نے اپنا کوئی کلام شائع کرنے کے لئے روانہ نہیں کیا۔ پھر آپ کس بنا پر اپنے ناظرین سے میرے کلام کے شائع ہونے کا وعدہ کر رہے ہیں۔ آپ جلد سے جلد اس خلاف قانون حرکت کی تلافی کریں ورنہ مجبوراً عدالتی چارہ جوئی کرونگا" بہرحال اقبال بعد میں جب گورنمنٹ کالج میں پروفیسر ہو گئے اور انکی شہرت نصف النہار پر پہونچی تو سر شیخ عبدالقادر کی وساطت سے اُن کی نظمیں "مخزن" میں شائع ہونے لگیں

۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۸ء تک ڈاکٹر اقبال کا قیام انگلستان میں رہا۔ یہ عہد انکی اسلامی بیداری کا عہد تھا انکے اس تعلیمی دور میں تاریخ اور فلسفہ کے مطالعہ اور مشاہدات و تجربات دنیادی سے ان کے خیالات بھی بدلے شخصی اور اجتماعی زندگی کی تعمیر کے سبق ملے۔ اسلام کی عظمت اور ملی زندگی کا جوجذبہ ان کے دل میں ازل سے موجود تھا۔ تاریخ کے مطالعہ نے اور زیادہ اُسے ابھار دیا۔ اسلامی دنیا کے حالات اور مسلمانوں کی عام پستی اور بیچارگی دیکھ دیکھکر آپ نے آنسو بہانا شروع کر دیا۔ حضرت رسالت مآب صلعم سے جو محبت تھی رو نگٹے رونگٹے میں پیوست ہو گئی آنکھیں جسم اسلام کے ہر ناسور پر اشکبار ہونے لگیں۔ غیر ممالک کی تہذیب اور تمدن کے مشاہدے کے ردِ عمل سے تجدیدِ ملت کے خیالات اسقدر پیدا ہوئے کہ اقبال نے اپنے درد کی شکایت بارگاہ ایزدی تک پہونچائی یہ "شکوہ" اور "اسکا جواب" "شمع اور شاعر" "خضر راہ" اور "طلوعِ اسلام" اس عہد کی بےچینیوں کا عکس ہیں قومیت کی چارہ سازی کے ساتھ ساتھ اس کی ستم شعاری پر جب نظریں پڑیں تو انھوں نے "وطنیت" لکھکر قومیت سے قطع تعلق کا اعلان کر دیا۔ اقبال کے دل میں عالمگیر پیغام دینے کا حوصلہ پیدا ہوا۔ دین کی رسی کو مضبوط پکڑ کر اسلامک کلچر کے احیا ے نو کی عام دعوت دینے کی امنگ لہریں مارنے لگی اس کے لئے انکو ایک نئی زبان کی ضرورت محسوس ہوئی۔ فارسی چونکہ دنیائے اسلام کی عام فہم زبان ہے دوسرے یہ کہ فارسی اسلامی تصوف اور تہذیب کی زبان ہے لہذا اقبال نے فارسی زبان کو ذریعۂ اظہار خیال بنایا اور "مثنوی اسرار و رموز" "پیام مشرق" "زبور عجم" "جاوید نامہ" اور ایک چھوٹا سا مجموعہ "پس چہ باید کرد اے اقوام شرق" لکھا

مثنوی "اسرار و رموز" میں ڈاکٹر اقبال نے "شخصیت" کی تعمیر کے راستے بتائے ہیں جسمانی اور روحانی قوت پیدا کرنا خودی ہے۔ اور خودی سے گذر کر کسی اور بلند مقصد کو مدنظر رکھنا بیخودی۔ خودی کے لئے شخصی ارادے کی ضرورت ہے۔ اور بے خودی کے لئے دین، علم اخلاق، اور ملت کی جو خودی کا درس دے۔ چنانچہ اسلام خودی اور بیخودی

کے ایک مستقل مرکب کا دوسرا نام ہے "مثنوی" "اسرار و رموز" میں انہیں مسائل پر مثالوں، مکالموں اور حکایتوں سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ "پیام مشرق" میں خودی کی تعلیم کو پس منظر بنا کر نظمیں لکھی گئی ہیں۔ "زبورِ عجم" کی غزل سرائی میں تصوف کے مسائل غلاموں کے فنون لطیفہ اور مذہبی خصوصیات کا تذکرہ ہے "جاوید نامہ"، آسمانی صبر کی تصویر ہے۔ اور اقبال کے بعض سیاسی خیالات کی آئینہ دار۔

اس عہد میں اُردو نظموں کے دو مجموعے بھی شائع ہوئے "بالِ جبریل" اور "ضربِ کلیم" ان دونوں مجموعوں میں ڈاکٹر اقبال کا پوری طور پر اسلامی دل و دماغ بجا نا قدرتی نشو نما کی ایک مثال ہے۔ ان نظموں میں سیاست اور معاشرت پر بہت زیادہ درس دیا گیا ہے۔ اور اکثر نظمیں سرمایہ داری اشتراکیت، ملوکیت کو مٹانے کی تمنا اور کسان اور مزدور کو ظلم سے بچانے کی آرزو میں لکھی گئی ہیں۔

ڈاکٹر اقبال مرحوم پہلے مسلمان تھے اور بعد میں ہندوستانی۔ آپ کی زندگی درویشانہ تھی۔ معمولی بستر پر تکیہ لگائے بیٹھے رہتے۔ حقہ ہر وقت لگا رہتا۔ بڑے بڑے ذی علم اور ذی اقتدار اُن کے آستانے کو گھیرے رہتے۔ دنیاوی ساز و سامان اُنکے پاس کچھ نہ تھا۔ ایک بنیائن پہنے اور تہہ باندھے بڑے بڑے علمائے یورپ اور سفرائے عالم سے ملاقات کی سیدھا سادہ پہنا۔ سادہ کھایا۔ معمولی مکانوں میں رہے۔ عزلت نشینی بہت پسند تھی۔ عام مجالس میں شرکت سے انکار کر دیتے تھے۔ اپنے گوشے میں بیٹھے بیٹھے اُن کی نظر تمام عالم پر رہتی تھی۔ مغربی ممالک میں کوئی تصنیف ایسی نہ تھی جو ان کے پاس نہ آجاتی ہو۔ گفتگو مسلسل اور مدلل ہوتی تھی جس میں اچھی خاصی تقریر کا لطف آجاتا تھا۔ جسم اور روح کی تقسیم جو دوسرے مذاہب میں پائی جاتی ہے اقبال کا اکثر مبحث رہا ہے۔ ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ کچھ ہندو رشی سوامی جی کی ایک سیرت لکھکر اقبال کے پاس لائے اور نظر ثانی اور مزید اضافے کی درخواست کی۔ اقبال رشی سوامی جی کے بچپن کے دوست تھے۔ اقبال نے الٹ پلٹ کر کتاب دیکھی اور فرمایا "تم لوگوں نے سوامی جی کی زندگی سے کوئی سبق نہیں لیا۔ سوامی جی کا ہندو مذہب کے مطابق یہ عقیدہ تھا کہ جسم، کا وجود ایک گناہ ہے اور جسم کو جسقدر بھی ایذا پہونچائی جائے۔ اتنا ہی مذہبی فرض ادا ہوتا ہے۔ برخلاف اس کے اسلام "جسم" اور "روح" کی حد بندی کر دیتا ہے، اور مقرر کردہ حدود میں رہنا اسلام کی تعلیم ہے۔ ایک مرتبہ سوامی جی اپنے "برہمچاریہ" کے سلسلہ سے امریکہ گئے تھے وہاں ان کے بہت مرید ہوئے۔ لیکن ایک مریدنی کو بہت زیادہ فیض پہونچا۔ لیکن بعد میں جب سوامی جی واپس آئے۔ تو عورت اور بچہ کو امریکہ ہی میں چھوڑ آئے۔ اُن کی زندگی کا یہ واقعہ بہت سبق آموز ہے اس لئے کہ "برہمچاریہ" کا اتنا بڑا پیرو بھی اپنے مقصد میں ناکام رہا۔ سوامی جی برہمچاریہ کو نباہ نہ سکے اور ایک مزید اخلاقی گناہ کے مرتکب ہو گئے یعنی اُس عورت اور بچہ کو امریکہ ہی میں چھوڑ دیا۔ آپ کو اس سے سبق لینا چاہیے کہ "جسم" کو کبھی بھی مارا نہیں جا سکتا

اس میں خودی ہے جتنا دباؤ اتنا ہی اُبھرتا ہے جتنا ٹھکراؤ اتنا ہی اکڑ پٹتا ہے۔ اسلام جسم کو مارنے کی تعلیم اسی لئے نہیں دیتا۔

اقبال مرحوم بہت خوددار تھے اور اسلام کے بہت بڑے شیدائی۔ شعر کہتے وقت ایک خاص قسم کی رقت طاری رہتی تھی۔ خود بخود شعر کہنے پر آمادہ ہو جاتے تھے اشعار خود زبان سے ادا ہونے لگتے تھے ہمنشیں نوٹ کر لیا کرتے تھے خود کاغذ اور قلم لیکر کبھی فکر نہیں کی اور نہ فرمائشی چیزیں تیار کر سکے ان کے دل و دماغ میں حضرت رسالت مآب صلعم کی محبت سرایت کر گئی تھی۔ اور جب کبھی آنحضرت کا ذکر آ جاتا تھا تو آبدیدہ ہو جاتے اور یہ کیفیت دیر تک طاری رہتی۔ ایک دفعہ ایسا ہوا کہ ایک بزرگ درویش اقبال کے پاس آئے۔ باتیں ہونے لگیں۔ اقبال نے سائیں جی سے کہا کہ میرے واسطے دعا کیجئے۔ سائیں جی نے دریافت کیا کہ آپ کو دولت چاہیئے یا عزت وجاہ؟ ڈاکٹر صاحب نے جواب دیا کہ" سائیں جی۔ اللہ کا شکر ہے کہ ان دونوں میں سے کسی کی میرے پاس کمی نہیں جب ضرورت سب کچھ موجود ہے" سائیں جی نے پھر پوچھا کہ "کیا خدا سے ملنا چاہتے ہو" اقبال کی آنکھیں چمک اٹھیں" خدا سے ملنا! سائیں جی خدا خدا کرو۔ وہ کیونکر مل سکتا ہے! میں بندہ۔ وہ معبود۔ میرا اس کا رشتہ صرف بندگی کا ہے۔ ملنا کیا معنی؟ اگر خدا مجھ سے ملنے بھی آئے تو میں کوسوں دور بھاگ جاؤں۔ وہ دریا ہے اور میں قطرہ۔ قطرہ دریا سے مل کر کب قطرہ رہ سکتا ہے میں قطرہ ہی رہنا چاہتا ہوں۔ اپنی حقیقت کو مٹانا نہیں چاہتا۔ البتہ قطرہ رہ کر دریا کے خواص پیدا کرنا چاہتا ہوں" سائیں جی بیخود ہو کر جھومنے لگے

ڈاکٹر اقبال مرحوم کا پہلا مجموعۂ کلام "بانگ درا" ۱۹۲۴ء میں شائع ہوا۔ وہ اسقدر مقبول ہوا کہ اب تک اس کے تین ایڈیشن ہو چکے ہیں۔ پہلا تین ہزار کا۔ دوسرا پانچ ہزار کا اور تیسرا دس ہزار کا۔ ۱۹۳۵ء میں بال جبریل شائع ہوا اور پھر ابھی حال میں ان کا تیسرا مجموعہ "ضرب کلیم" نکلا۔ اقبال کی ایک تصنیف انگریزی زبان میں بھی بطور یادگار ہے (The Reconstruction of Religious Thought in Islam)

اقبال کی یہ تصانیف زمانہ میں یادگار رہیں گی۔ وہ غیر فانی اسلامک لٹریچر بن کر زندہ رہیں گی۔ ان کی شرحیں کی جائینگی نظریہ قائم ہوں گے فلسفہ تیار ہو گا۔ دلیلیں ڈھونڈھ کر نکالی جائیں گی۔ آیاتِ قرآنی، احادیث، مثنوی مولانا روم علیہ الرحمتہ اور حکیم سنائی کے تاثرات سے ان کا مقابلہ کیا جائے گا۔ اور اقبال کا پیام زندۂ جاوید بنکر رہیگا!!!

اقبال اور طالب علم

(سید شرافت علی، صبا لکھنوی۔ مدیر معاون)

شام کی اندھیاری چھاتے ہی لوگ اپنے اپنے گھروں میں دیا جلا کر تاریکی کو دور کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اگر کسی کا کوئی عزیز مر جاتا ہے تو بھی لوگ گھروں میں یاد کے دیئے جلاتے ہیں۔ تاکہ مرنے والے کے غم کی اندھیاری چھٹ جائے۔ ہم کہ موت سے ڈرنے والے انسان ہیں کسی کی یاد کو بھلا کیونکر تازہ کر سکتے ہیں۔ ڈاکٹر اقبال مرحوم کا قول تھا کہ موت آئے تو مسکراتے ہوئے اُس کا استقبال کرو۔ مرحوم نے عمر بھر ہم کو جینے کے گُر بتائے اور جب چلے تو مرنے کا بھی ایک ڈھنگ بتا گئے کہ ہر از زندگی بہتر

ڈاکٹر اقبال ہماری محفل سے کیا اُٹھے، ساری رونق خدا جانے کب تک کے لئے اٹھ گئی ہم اگر رو کر اُس کا تدارک کرنا چاہیں تو لاحاصل ہے۔ نہیں اقبال ہماری بزم میں ایک "شمع" روشن کر گئے ہیں جو ہر طرف سے پروانوں کو اپنے گرد جمع کر رہی ہے۔ اب ہمارا یہ فرض ہے کہ ہم اس "شمع" کی روشنی سے جہاں تک ممکن ہو سکے نور حاصل کریں۔ اور اس کی روشنی میں اپنے "خد و خال" پہچاننے کی کوشش کریں۔ اور اگر ہم پہچان لیں تو سمجھئے کہ ہم بھی آنکھ والے ہیں جن میں بھی نور موجود ہے جس کی طرف اقبال کا ارشاد ہے۔ ؎

تو اگر اپنی حقیقت سے خبر دار رہے نہ سیہ روز رہے اور نہ سیہ کار رہے

اقبال مرحوم کی تعلیمی زندگی اتنی آئیڈیل گذری ہے کہ خدا ہم سب کو نصیب کرے تعلیم سے ان کو اس قدر رغبت تھی کہ عمر بھر وہ اپنے اصلی معنوں میں طالب علم رہے یہ بہت بڑی حد تک اُن کے دل و دماغ کا نشو و نما ہی ہمارے لئے "درس اولیں" کا مرتبہ رکھتا ہے اقبال کے کلام کا وہ حصہ جس میں انھوں نے تعلیم اور تدریس سے کام لیا ہے "ایک مکڑا اور مکھی" "ایک پہاڑ اور گلہری" "ایک گائے اور بکری" "بچے کی دعا" اور "ہندوستانی بچوں کا قومی گیت" کی نظموں پر مشتمل ہے یہ نظمیں طفلانہ استعداد اور نوآموز قوت تخیل کو مدِ نظر رکھ کر لکھی گئی ہیں۔ اور ان میں وہی سبق موجود ہے جو اعلیٰ درجہ کی اخلاقی تربیت اپنے اندر چھپائے ہوئے ہے ایک دوسرا رُخ بچوں سے تخاطب کا ان نظموں سے روشن ہوتا ہے جو انھوں نے عالم طفلی پر خود متاثر ہو کر والہانہ انداز میں لکھی ہیں مثلاً "ماں کا خواب" "عہد طفلی" "طفل شیر خوار" "بچہ اور شمع"....... کی گود میں بلی دیکھ کر" وغیرہ۔ ان نظموں میں سراسر شاعری ہے اور ایک فلسفیانہ "مشاہدہ گستری" اور دلیل پائی جاتی ہے۔

اس کے بعد ان کے کلام کا وہ ضروری جزو ہے جو بالخصوص نوجوان طلبا کے لئے ہے اور اس جزو میں اقبال کا تخاطب ارباب قوم و ملت کے ساتھ ساتھ خود طالب علموں سے بھی ہے اس میں "طلبائے علی گڈھ کالج کے نام" "خطاب بہ جوانانِ اسلام" "تعلیم اور اس کے نتائج" اور "مسلمان اور تعلیم جدید" نظمیں آتی ہیں۔ علی گڈھ کالج کے طلبا کو جو نظم سنائی ہوئی ہیں

اقبال نے قدرت کے نظام کی نیرنگی کو "پس منظر" بنا کر دنیا کی انقلاب آفرینی کا سبق دیا ہے اور تجدید خیال کے اشارے کئے ہیں۔ "نوجوانانِ اسلام سے خطاب" میں ملت اور دین اسلام کی طرف رغبت دلانے کا پرزور اعلان ہے۔ قدیم اسلامی تہذیب اور ملی زندگی کو یاد دلایا ہے۔ اسلامی علم و فن کے ذخیرے کی جانب توجہ مبذول کرائی ہے چنانچہ فرماتے ہیں ؂

خوش تو ہیں ہم بھی جوانوں کی ترقی سے مگر　　لبِ خنداں سے نکل جاتی ہے فریاد بھی ساتھ
ہم سمجھتے تھے کہ لائے گی فراغت تعلیم　　کیا خبر تھی کہ چلا آئے گا الحاد بھی ساتھ

"مسلمان اور تعلیم جدید" میں اقبال نے ہمارے مستقبل کو پہلے سے محسوس کر کے ہیں کچھ مشورے دیئے ہیں اور تہذیب جدید کے تقابل سے ہمارے لئے صحیح نقشے اور نصب العین تیار کیا ہے ؂

وہ شعلۂ روشن ترا ظلمت گریزاں جس سے تھی　　گھٹ کر ہوا مثلِ شرر تارے سے بھی کم نور تر
شیدائی غائب نہ رہ، دیوانۂ موجود ہو　　غالب ہے اب اقوام پر معبودِ حاضر کا اثر
اس دور میں تعلیم ہے امراضِ ملت کی دوا　　ہے خونِ فاسد کے لئے تعلیم مثلِ نیشتر

ڈاکٹر اقبال خوب جانتے تھے کہ ہم نوجوانوں ہی پر ملت اور قومیت کے مستقبل کا دارومدار ہے چنانچہ انھوں نے نوجوانوں کی ذہنیتوں کو بدلا اور ہیں اس بات کو محسوس کرایا کہ ہم اُس قوم کے افراد ہیں جس سے قیصر و کسریٰ کے پائے استقامت متزلزل ہو جاتے ہیں رنگ و بو میں مبتلا ہو جانے والے نوجوانوں کو انھوں نے احیائے نو کی جھلکیاں دکھلائیں چنانچہ ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے ؂

تری دعا ہے کہ ہو آرزو مری پوری　　مری دعا ہے تری آرزو بدل جائے

ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ ایک روز شام کے وقت اسلامیہ کالج کے کچھ طلبا وفد کی صورت میں ڈاکٹر صاحب کے پاس حاضر ہوئے اور ڈاکٹر صاحب سے مشاعرے کی صدارت کے لئے درخواست کی۔ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ میں کسی مجلس یا جلسہ کا صدر بننا نہیں چاہتا ہوں البتہ تم کو یہ مشورہ دیتا ہوں کہ تم لوگ "شعر بازی" سے دور رہو۔ آپ نے فرمایا کہ اس وقت ہندوستان کو اور خصوصًا مسلمانوں کو شعر بازی کی ضرورت نہیں اور نہ ہر شخص اس کا اہل ہوتا ہے۔ شعر کہنے پر لوگ آسانی کے ساتھ اس لئے آمادہ ہو جاتے ہیں کہ بغیر پیسہ کوڑی شہرت ملتی رہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بہت کم شاعر ایسے ہیں جن کے کلام میں بقا پائی جاتی ہے۔ آپ نوجوان ہیں، آپ کو اس غلطی میں نہ پڑنا چاہئے۔ ضرورت نثر نگاروں کی ہے جو مطالعہ اور محنت کے بعد اردو زبان میں معلومات کا اضافہ کریں اور اپنے آپ کو اور اپنی ملت اور قوم کو بہتر بنائیں۔ ڈاکٹر صاحب کی اس مختصر سی تقریر سے سب کا جوش ٹھنڈا ہو گیا اور سب کے سب بورڈنگ ہاؤس واپس چلے گئے

ایک بار کا ذکر ہے کہ کچھ کالج کے طلبا ڈاکٹر صاحب کے پاس ملنے آئے باتوں باتوں میں ایک نامور بزرگ جو لاہور میں تشریف لائے ہوئے تھے ان کی ایک تقریر کا ذکر چھڑ گیا اور طلباء نے بہت شدت کے ساتھ مقرر صاحب کی استادی اور کمال کا

بیان کیا۔ ڈاکٹر صاحب سنتے رہے اور مقرر کی غیر معمولی صلاحیت کو تسلیم کرتے ہوئے فرمایا کہ انبیاءکرام کو چھوڑ کر جو لوگ بلا ضرورت تقریریں کرتے ہیں اور اپنا بیشتر وقت صرف کرتے ہیں اُنہیں روحانیت کا عنصر فوت ہو جاتا ہے۔ فرمانے لگے کہ میں بھی انگلستان کی طالب علمی میں بہت زیادہ مقابلہ کی تقریروں وغیرہ میں حصہ لیا کرتا تھا اور بڑا با ترقی تھا لیکن بعد میں میں نے اپنی اس عادت کو ترک کر دیا۔ اپنے بیان میں وقتی گرمی اختیار کر اُس سے خراج تحسین حاصل کرنے کے لئے دھواں دھار تقریریں جو لوگ کرتے ہیں وہ وقیمت، مطالعہ صحت اور طبیعت کو بہت کم بنا سکتے ہیں۔ البتہ تحریر سے کام لینے والوں کو کاوش اور وقت کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور حقیقتاً انکی محنت قابل ستائش ہوتی ہے اس لئے کہ انکی تحریروں میں پورا پورا استدلال پایا جاتا ہے

طالب علمی کے زمانہ میں شعربازی کا شوق پیدا ہو جاتا۔ ہندوستان میں اور خصوصاً اُن حضرات میں جن کے یہاں اُردو گھر کی لونڈی ہوتی ہے ایک عام چلن ہے۔ چنانچہ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ حضرت اقبال کو ایک صاحب نے ایک عریضہ روانہ کیا جس میں انھوں نے ڈاکٹر صاحب سے تلمذ کی درخواست کی۔ ڈاکٹر صاحب نے جواب میں لکھ دیا کہ ہر آدمی کو طبیعت آسمان سے ملتی ہے اور زبان زمین سے۔ اگر تمھاری طبیعت شعر کہنے کے لئے موزوں ہے تو خود بخود شعر ہوں گے۔ رہا زبان کا سوال سو اس کے لئے میں مناسب نہیں۔ مثل مشہور ہے کہ شاعری ایک "بے پیر افن ہے" لوگ اس مثل سے شاعری کی توہین مراد لیتے ہیں لیکن میں ایک "حقیقت" پاتا ہوں۔ شاعری میں کسی پیر یا استاد کی ضرورت نہیں بمصداق "الشعراء تلامیذ الرحمٰن"۔

ڈاکٹر اقبال نے ہمیشہ نوجوانوں کی فلاح اور بہبود کا خیال رکھا اور سمجھتے رہے کہ انکی خدمت بہت بڑی خدمت ہے گذشتہ دنوں میں جب "یوم اقبال" تمام ہندوستان کے طول و عرض میں منایا گیا تھا سر سکندر حیات خاں وزیر اعظم صوبۂ پنجاب کی تجویز تھی کہ اقبال کو کچھ زر نقد کی تھیلی بطور عطیہ پیش کی جائے۔ لیکن اقبال نے شکریہ کے ساتھ اور بڑی خندہ پیشانی سے اس نذر کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اور ارشاد فرمایا کہ میری دلی خواہش ہے کہ ایک اسلامک ریسرچ انسٹیٹیوٹ قائم ہو جس میں مسلمان طلباء کی دینی تعلیم کا انتظام آسانی کے ساتھ ہو سکے۔ اور ملک کے نوجوان کثرت سے اُس سے مستفیض ہو سکیں

اقبال مرحوم نے اپنے خیالات، اپنے علم و فضل اور اپنی تہذیب و تمدن سے ہمارے لئے ایک سچے مسلمان اور سچے انسان ہونے کی مثال پیش کی ہے۔ ہم یوپی کے رہنے والوں کو انکی صحبت سے کوئی فیض حاصل نہ ہو سکا۔ ضرورت اس امر کی تھی کہ اس خزانے سے جو سینکڑوں برس کے بعد بارگاہِ ایزدی سے ہم تک پہونچا تھا جہاں تک ہو سکتا اپنے "جیب و دامن" کو بھر لیا جاتا لیکن بدقسمتی ہماری کہ ہمارے "پر و بال" جب نکلنے شروع ہوئے اور "سامانِ حیات" کی ضرورت کا احساس پیدا ہوا تو یہ "خزانے" کا دروازہ ہی بند ہو گیا۔ خیر! جو کچھ ہمیں مل گیا ہے اس کو غنیمت سمجھیں اور اس کے اثاثہ سے زیادہ سے زیادہ سرمایہ حاصل کرنے کی فکر کریں۔

اقبال کی شاعرانہ حیثیت

(محمد ذوالفقار علی صدیقی متعلم درجہ دہم - اے)

ان کی باکمال شخصیت دراصل تین شخصیتوں کی مجموعہ تھی۔ وہ نہ صرف ایک مدبّت آفریں شاعر تھے بلکہ ایک عالی مفکّر فلاسفر اور ایک ماہر سیاست بھی تھے۔ مگر ان تمام شخصیتوں میں جس چیز نے اقبال کو اپنی گذشتہ اور موجودہ شعرا اصنف میں ممتاز کر دیا ہے وہ ان کی انقلابی شاعری تھی جس کی قدر صحیح طور پر آئندہ آنے والی نسلیں کر سکیں گی۔ کیونکہ کسی شاعر کی زندگی میں اس کے جلیل القدر خدمات کا اندازہ لگانا اگر دشوار نہیں تو مشکل ضرور ہے خصوصاً اقبال ایسے شاعر کا جن کی ذہنی دنیا ایک مجسمہ انقلاب تھی اور جن کا ہر کارنامہ ایک نئے رنگ میں رنگا ہوا منظر عام میں پیش ہوا۔ اقبال کے مجموعۂ کلام کو اگر بہ نظر غور و انصاف دیکھا جائے تو ان کی ذہنی ارتقاء کا ہر ایک پہلو یعنی فطری حبّت پسندی۔ ان کی وطن دوستی۔ انکی سیاست۔ ان کا فلسفہ۔ مولانا روم سے والہانہ عقیدت۔ اسلام اور مسلمانوں سے پرخلوص محبت۔ تہذیب مغرب سے بیزاری۔ جرأت رندانہ۔ فقیری اور قلندری وغیرہ سے ایک عجیب حقیقت اور روح پرور کیفیت کا اظہار ہوتا ہے۔ مختصر یہ ہے کہ ان کے قلب و دماغ کی غیر معمولی وسعتیں اور بے انتہا گہرائیاں ایک رسمی شاعر سمجھنے سے قطعاً قاصر ہے۔

حقیقتاً اقبال کے کلام کی عظمت اور انکی خصوصیات اور صف شعرا میں انکا امتیازی درجہ کا فیصلہ خود زمانہ کریگا مگر ان کی شاعری نے جو اثر موجودہ زمانہ کے لوگوں پر ڈالا ہے اور اس سے تعلیم یافتہ طبقہ کی ذہنیت میں جو انقلاب عظیم پیدا ہوا ہے وہ ارباب ادب سے مخفی نہیں۔

اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اقبال سے قبل ہندوستان میں چند شعرا ایسے گذرے ہیں جنھوں نے اردو شاعری کے معیار کو بلند اور گذشتہ فرسودہ طریقوں میں اصلاح کرنے کی از حد کوشش کی اور وہ بڑی حد تک اس میں کامیاب بھی ہوئے مگر اقبال نے اس معاملہ میں جس جرأت سے کام لیا اور تنگ نظر اور نا اہل لوگوں کی طعن و تشنیع کی پرواہ نہ کر کے جس طرح ادبی خدمات انجام دیں اسی کا اثر ہے کہ ہندوستانی شعرا اس سے بیحد متاثر ہوئے۔ اب اگر انکی ذہنی ارتقاء کا اندازہ کیا جائے تو گذشتہ اور موجودہ شاعری کے رنگ میں ایک نمایاں تبدیلی نظر آئیگی۔ اور نہایت وثوق کے ساتھ یہ کہنے کی جرأت کرتا ہوں کہ اگر اقبال ایسا شاعر نہ پیدا ہوتا تو شاعری کا نہ صرف اصل مفہوم اور مقصد ہی فوت ہو جاتا بلکہ شاعری بجائے ایک مفید مشغلہ کے "کار بیکاراں است" ہو کر رہ جاتی۔ اسکا صحیح اندازہ صرف اس طرح ہو سکتا ہے کہ اقبال کی شاعری کا موازنہ گذشتہ شاعری سے کیا جائے تو اقبال کو اپنی عدیم المثال خصوصیات

کی بنا پر اقلیم سخن کا تاجدار تسلیم کرنا پڑیگا۔

سب سے زیادہ انقلابی کارنامہ اقبال کی شاعری کا یہ ہے کہ اقبال نے تخئیل کی جولانیوں کے لئے ایسا میدان پیدا کیا ہے جس کی طرف متقدمین کی توجہ بھی منعطف نہ ہوئی تھی بلکہ یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ ان کا دماغ کبھی اس جدّت فکر کی جانب مائل ہی نہ ہوا تھا۔ اس کا فوری اثر یہ ہوا کہ قدیم مبتذل اور سوقیانہ شاعری تعلیم یافتہ طبقہ کی نظر سے بالکل گر گئی۔ کذب و مبالغہ اور جھوٹی معاملہ بندی پر شاعری کا دارومدار تھا۔ مثنوی کے فرضی اور بعید از قیاس قصّے اور قصیدہ کی مبالغہ آمیز دھوم دھام رفتہ رفتہ ہماری نظروں میں بے وقعت ثابت ہونے لگی۔ اور تناسب لفظی اور دور از کار تشبیہوں اور استعاروں کے بجائے انھوں نے حقیقت کی ترجمانی میں اپنے زورِ کلام کو صرف کیا۔ دورِ حاضرہ کے پیچیدہ مسائل کو اقبال نے اس خوبی سے حل کیا ہے کہ دراصل شاعری کا موضوع ہی بدل گیا۔ اس کا اعتراف خود اقبال اپنے اشعار میں بابانگ دہل کر رہے ہیں

کہتا ہوں وہی بات سمجھتا ہوں جسے حق — نے ابلہِ مسجد ہوں نہ تہذیب کا فرزند
اپنے بھی خفا مجھ سے ہیں بیگانہ بھی ناخوش — میں زہرِ ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند

اقبال پر ایک سب سے بڑا الزام یہ ہے کہ انھوں نے لوازم غزل کی پابندی نہیں کی اور ایسے خشک مضامین باندھے ہیں جس کی کہ ہماری شاعری متحمل نہیں ہو سکتی۔ علاوہ بریں زبان اور محاورہ کا خیال نہ کیا اسکا جواب اقبال کی زبان سے خود سن لیجئے

نہ زباں کوئی غزل کی نہ زباں سے باخبر میں — کوئی ہو صدائے دلکش وہ عجمی یا کہ تازی
میری نوا میں نہیں ہے ادائے محبوبی — کہ بانگ صورِ سرافیل دلنواز نہیں
میری نوائے پریشاں کو شاعری نہ سمجھ — کہ میں ہوں محرمِ رازِ درونِ میخانہ
خوش آ گئی ہے جہاں کو قلندری میری — وگرنہ شعر میرا کیا ہے شاعری کیا ہے

مختصر یہ ہے کہ اقبال نے شاعری کا اسلوب ہی بالکل بدل دیا موجودہ زمانہ شاعری میں آزادہ روی۔ حقیقت نگاری۔ لوازمات شاعری سمجھے جاتے ہیں اور خدا کا شکر ہے کہ کلام اقبال کا یہ اثر ہوا کہ ہماری شاعری اب عامیانہ اور بازاری خیالات۔ معشوق اور جورِ فلک کے ماتم۔ رقیب روسیاہ کے رشک حسد۔ شکوہ و شکایت سے پاک ہوتی جا رہی ہے

اقبال دراصل اس نظریہ کی تبلیغ کرتے ہیں کہ اگر خیال اچھا ہے تو اس کا پیرایہ بیان خود ہی اچھا ہو جائیگا اور اس کے سمجھنے اور سننے والے بھی بغیر کسی پروپیگنڈا کے مل جائیں گے

اقبال کی باکمال شاعری کا دوسرا جزو یہ ہے کہ وہ اپنے کلام کو جام صہبا بنا کر گردش میں نہیں لانا چاہتے بلکہ

وہ اہلِ محفل کو دعوت دینا چاہتے ہیں کہ وہ اپنے ہی وجود سے خود مئے لالہ فام نکالیں۔ جو اس کو پسند نہیں کرتے اور ذوقِ خودی نہیں رکھتے اُن سے اقبال بھی مخاطب نہیں اس وجہ سے ان کا تخیل دور نکل گیا ہے اور اُن کے پیروی کرنے والے بھی ہندوستان میں کم شاعر ہیں۔

اقبال نے غزل گو شعرا کی بدمذاقی اور بوالہوسی کی توضیح اس شعر میں خوب کی ہے۔

ہند کے شاعر و صورت گر و افسانہ نویس　　اور بیچاروں کے اعصاب پر عورت ہے سوار

مختصر یہ کہ اقبال کی شاعری کا اثر یہ ہوا کہ قدیم طرزِ شاعری بالکل متروک ہوگیا ہے۔ آج ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں ہزاروں ایسے پختہ مشق شاعر اقبال کے مقلد پیدا ہو گئے ہیں اور الحمدللہ کہ اُن کی اُردو شاعری، ابتذال اور اہمال سے پاک ہو رہی ہے۔ یہی وہ خصوصیات ہیں کہ جن کی بنا پر اقبال مذہب شعر و سخن کا مجدد اور امام مانے جائیں گے۔ اِن کے نام سے اُردو شاعری کا نیّر اقبال ہمیشہ تاباں رہیگا۔

غزل

یعقوب علی روشن صدیقی متعلم درجہ دہم

انکا جب انتظار ہوتا ہے　　ہر نفس کا شمار ہوتا ہے

حسن جب ہوشیار ہوتا ہے　　کوئی رشکِ بہار ہوتا ہے

ترکِ اُلفت بجا سہی لیکن　　دل پہ کب اختیار ہوتا ہے

اپنی ہستی کو بھول جاتا ہوں　　جب تصور میں یار ہوتا ہے

لذتِ غم کو جانتا ہے وہی　　جس کا سینہ فگار ہوتا ہے

جس کو کیفِ شراب کہتے ہیں　　عشق کا وہ خمار ہوتا ہے

جب نہیں اُن سے کچھ امید روشن
درد کیوں بار بار ہوتا ہے

محبت

محمد الیاس صدیقی متعلم درجہ دہم "ب"

محبت اک خلش ہے جو دلوں کو گدگداتی ہے   تپش ہے اور رگوں کی تہ میں چھپکر جھلملاتی ہے
بچائے اس سے جو دامن کو اپنے سخت ناداں ہے   یہی شعلہ طرازی غنچۂ دل کو کھلاتی ہے

دنیا عجائبات کا مخزن ہے مگر اس کے دیکھنے کے لئے دیدۂ بصیرت ہونا چاہئے۔ یہاں کی کوئی چیز حکمت سے خالی نہیں۔ ذرہ ذرہ میں آفتاب حقیقی نمایاں ہے۔ پتے پتے میں قدرت کی گلکاریاں ظاہر ہیں۔ ہر پھول میں اسی کا رنگ و بو ہے۔ ہر بلبل کی زبان پر اسی کا نغمہ جاری ہے مگر اس کے سننے کے لئے کان ہونا چاہئیں۔ بقول شاعر

محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا   یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

خدا جانے لوگوں نے محبت کو کیا سحر تصور کر لیا ہے اور اسی خام خیالی کے ماتحت جہاں کہیں "محبت" کا نام آیا انھوں نے اپنی لغت بے معنی سے کام لیا اور لطف یہ کہ محبت کی کرشمہ سازیوں پر والہ و شیدا ہیں لیکن محبت سے ناآشنا۔

حقیقت یہ ہے کہ محبت ایسی شے دنیا میں اور کوئی نہیں۔

لیلائے شب نے اپنے گیسو پھیلائے۔ آفتاب مجنوں صفت سرگرداں گوشۂ مغرب میں چلا گیا۔ ماہتاب نے بلند ہو کر چپہ چپہ اپنی منور کرنوں سے روشن کر دیا ہے۔ رات میں دن کھلا ہوا ہے۔ سب لوگ اپنے کام سے فارغ ہو کر یا تو سو گئے ہیں یا سونے والے ہیں۔ ہاں! ان ہجراں نصیب کا ذکر نہیں جو کسی کی یاد میں پڑے ہوئے کروٹیں بدل رہے ہیں مگر خار غم نے جو رہ رہ کر پہلو میں چبھ رہا ہے، آنکھ لگنا حرام کر دیا ہے۔ اس وقت آدھی رات گذرنے کو ہے ایک حضرت نفسانی محبت کے فریب خوردہ ایک دریا کے کنارے بیٹھے اپنے دل سے اس طرح گویا ہیں "میں عشق و محبت سے کوسوں دور رہونگا اور حضرت عشق کو دور ہی سے سلام کروں گا بلکہ یہ زحمت بھی گوارا نہ کروں گا۔ اس ننھے سے کماندار نے میری ہی نہیں ہزاروں نوجوانوں کی زندگیاں برباد کر دی ہیں یہ ظالم اب بھی اسی طرح تیر کمان لئے پھرتا ہے اور اس کا نشانہ خدا کی پناہ۔ کبھی خطا نہیں کرتا مگر اہل نظر کے واسطے یہ بے وقت کی راگنی قابل تنفر ہے۔ کیونکہ قانون قدرت اس کی کلیتہً تردید کرتا ہے اور وہ بتاتا ہے کہ محبت کرنا گناہ نہیں

عشق و محبت انتہائی لطیف چیز ہے۔ اسی کی بدولت دنیا قائم ہے اسی کے ہاتھ میں عنان سلطنت ہے نظام عالم محبت ہی کا نتیجہ ہے۔ محبت روح کی غذا ہے جملہ امراض کی دوا ہے فرشتوں کا مذہب ہے۔ اولیاء کا مشرب۔ عاشقوں کی جان ہے۔ انبیاء کا ایمان ہے۔ خدا کی شان ہے بلکہ صاف کیوں نہ کہدوں، خدا خود سراپا "محبت" ہے۔ اس نے ہم گنہگاروں کو

اپنی محبت کا جلوہ دکھانے کے لئے) "ماں" کے دل میں اس کا معمولی سا پَرتو ڈال دیا ہے۔ اب آپ اندازہ کر سکتے ہیں۔ کہ جب ظل کا یہ عالم ہے تو اصل کیا شان ہو گی۔

لیکن یہ محبت اور ہے اور شباب میں جس قسم کی محبت نوجوانوں کے دل میں پیدا ہوتی ہے وہ اور ہے۔ نام کی مشارکت سے دھوکا نہ کھانا چاہیئے۔ ماں کی محبت عرش بریں سے آتی ہے جوانی کی دیوانی محبت "خمارِ گندم" کا نتیجہ ہے۔ ماں کی محبت سراسر ایثار و قربانی ہے جوانی کی محبت سراپا نفسانی ہے۔

محبت انسانیت کا دوسرا نام ہے۔ اگر دنیا محبت کے حقیقی معنی سمجھ لے تو یہ کل نہیں بلکہ آج ہی مستقل امن و امان کا مرکز بن جائے۔ بلکہ یوں کہیئے کہ جنت بن جائے۔

محبت دنیا کی تمام تکلیفوں، مصیبتوں۔ اور لڑائیوں کا واحد علاج ہے

محبت آنکھوں سے نہیں دل سے دیکھنی ہے سب سے پاکیزہ محبت وہی ہے جو ظاہر نہ کی جائے

شاعر کا دل جذبات کا آئینہ ہے اور اُسکے گیت سازِ محبت کے ترانے ہیں۔ غزل کے جتنے لوازم عرفی ہیں۔ اُن میں محبت کی چاشنی ضرور پائی جاتی ہے۔ مثلاً

حسن و عشق۔ ہجر و وصل۔ درد۔ داغ۔ دل جگر آہ۔ نالہ اثر۔ خال و خد۔ زلف و رخ بت و میخانہ۔ ساقی و پیمانہ گل و بلبل و شمع و پروانہ وغیرہ

محبت۔ ایک نامعلوم حقیقت ہے جو آنکھ سے ٹپکتی ہے اور دل سے چھلکتی ہے۔

محبت۔ ایک نرالا احساس بیخودی ہے جو حقیقت احساس کو بھلا دے۔

محبت۔ ایک کیف پرور شراب ہے جسے آنکھ پلاتی ہے۔ دل پیتا ہے۔

محبت۔ ایک مبہم مفہوم ہے جو نگاہ ادا کرتی ہے دل سمجھتا ہے۔

محبت بہت ہی جامع و مانع لفظ ہے اِس کی جسقدر توضیح کی جائے کم ہے محبت کرنیوالا شخص ہر لعو چاور قابل احترام ہوتا ہے۔ ظاہری محبت سراسر بوالہوسی ہے۔ محبت جتنی دیر میں ہوتی ہے اتنی ہی پائندہ ہوتی ہے جینے اور مرنے کا مزہ بھی اُسی کا ہے۔ جس کے سینہ میں درد انگیز محبت کا درد ہے اسی خیال کے مترادف چکبست کا یہ شعر خوب ہے۔

اگر دردِ محبت سے نہ انسان آشنا ہوتا نہ مرنے کا ستم ہوتا نہ جینے کا مزہ ہوتا

فی زمانہ لوگ اہل دول کے پرستار پائے جاتے ہیں کیونکہ اُن کے اغراض و مقاصد اہل دول کے رحم و کرم سے وابستہ ہوتے ہیں اور خدا کو بھول کر وہ اُن خداوند نعمت کو اپنا خدا سمجھنے لگے ہیں۔ میرے نزدیک وہ انسان ننگ خلائق ہے جو کسی فرعونِ وقت کے سامنے سر نیاز خم کرتا ہے ورنہ خوددار انسان کو بیانگ دہل یہ اعلان کر دینا چاہیئے

کیا غرض لاکھ خدائی میں ہوں دولت والے اُن کا بندہ ہوں جو بندے ہیں محبت والے

بدنصیب انسان

سروالٹر اسکاٹ کا شاہکار

کیا اس روئے زمین پر کوئی ایسا شخص ہے،
جس کا دل اس قدر مردہ ہے ــــ اور
وہ خود بھی بے حس ہے کہ ــــــ
جس کے ذہن میں یہ خیال نہ ہو!
کہ یہ "ہمارا وطن ہے"!!
جس کو ہم مادرِ وطن کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔

کیا کوئی شخص ایسا بھی ہے جس کو اُس وقت بھی ــــ
مسرت نہ ہوئی ہو جب کہ وہ غیر ممالک سے اپنے وطن کو آئے!
اگر کوئی ایسا متنفس ہے ــــ تو
اس کو غور سے دیکھو، بہ نظر غائر اس کی حالت کا جائزہ لو،
اس کی فطرت کا مطالعہ کرو ــــ تو تم کو ــــ
معلوم ہو جائے گا کہ اس کے پاس بہت سے خطاب ہیں، "بے پناہ"
دولت کا مالک ہے اور وہ اس پر مغرور ہے ــــ بے حد مغرور!!
لیکن دولت کی فراوانی، نمائشی خطابات کے دُم چھلے اور عارضی طاقت کا گھمنڈ محض بیکار ہے ــــ
وہ انتہائی بدقسمت انسان ہے!!
وہ انتہائی خود غرض ہے!
وہ زندگی ہی میں ــــ اپنا
سارا وقار ــــ اور دبدبہ کھو دے گا!!
کوئی اُسے عزت کی نگاہ سے نہ دیکھے گا!

اور بالآخر اسی غم میں —— وہ جہاں سے،
ہمیشہ ہمیشہ کے لئے نیست ونابود ہو جائے گا!
لیکن ——
اس کی موت پر
کسی کو رنج نہ ہوگا،
کوئی ماتم نہ کرے گا،
اور نہ اُس کا کوئی ثناخواں ہوگا!
کیونکہ —— !
وہ تو زندگی ہی میں مرچکا!
اس کے جسم کے عناصر — خاک میں مل جائیں گے،
مرنے کے بعد کوئی اس کا نام لیوا نہ ہوگا
ہاں اس کی زندگی بس اس قدر ہوگی کہ —— لوگ
اُسے بدبخت، بدنصیب اور بدقسمت کے لقب سے یاد کریں گے!
قابلِ نفرت ہے ایسا بدقسمت انسان !!!
(ترجمہ)
(از فلک سرورشش)

گلہائے نعت

(عتیق الرحمٰن - بجموری متعلم درجۂ ہفتم)

جب کچھ کہوں میں نعتِ رسالتمآب میں
پہلے زباں کو غسل دوں زمزم کے آب میں
کیا مدحِ مصطفےٰ کوئی انسان کر سکے
توصیف آپ کی ہے خدا کی کتاب میں
پردہ یہ ظاہری ہے حیات النبی میں آپ
گویا ہے آفتاب حجابِ سحاب میں
میں پردہ ہائے رازِ من و تو اٹھا چکا
اور ہوں کتابِ عشق کے پہلے ہی باب میں
محشر کے روز یہ ہے تمنا کہ اے عتیق
مامون ہوں میں ظلِّ رسالتمآب میں

"اقبال میری نظر میں"

جلال الدین صدیقی متعلم درجہ نہم - اے

علامہ ڈاکٹر اقبال کی ہستی ہندوستان کے لئے عموماً اور عالم اسلامی کے لئے خصوصاً مصلح اور قائد کی سی تھی۔ علامہ اقبال ایک ایسی شخصیت کے مالک تھے جس کا اندازہ ان چند سطروں سے کرنا دریا کو کوزے میں بند کرنے کے مرادف ہے اقبال کی قابلیت ان چند نظموں کے اندر محدود نہیں جو بانگ درا" "جاوید نامہ" "ضرب کلیم" "بال جبریل" "پس چہ باید کرد اے اقوام شرق" "مسافر" "خودی و بیخودی" وغیرہ پر مشتمل ہیں بلکہ یہ تمام اقبال کے دماغ کے ناپیدا کنار سمندر کی چند موجیں تھیں۔

اقبال نے جو غیر فانی شہرت اپنے دماغی اجتہاد سے حاصل کی ہے وہ یقیناً رہتی دنیا تک قائم رہے گی۔ اس وقت مسلمانوں کی حالت جس قدر ابتر ہے اس کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔ اقبال نے ایسی ہی آڑے وقتوں میں ہمت مرداں مدد خدا کے مشہور مقولہ کو اپنا ہادی راہ بنایا اور قوم کی فلاح و بہبودی کے لئے اپنا وہ غیر فانی کلام چھوڑ گئے ہیں جس نے انکو زندہ جاوید بنا دیا اور یہ سب کچھ میرے خیال میں شہید ملت مولانا محمد علی رحمۃ اللہ علیہ کے اس خیال کی تکمیل کی تھی جس کو وہ اکثر اپنی نظموں میں ظاہر کرتے تھے اور میں دعوی سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ بحیثیت ایک مسلمان کے اس میں بڑی حد تک کامیاب ہوئے۔ اقبال کی تمام نظمیں کسی نہ کسی جذبہ کے ماتحت لکھی گئیں ہیں جنمیں مذہب، سیاست فلسفہ قومیت وغیرہ سب کچھ آگیا ہے اُن کا ہر شعر دل کی گہرائی سے نکل کر دل کی گہرائیوں میں اپنا رنگ جما لیتا ہے۔ اقبال کی نظمیں ایک ایسی جاذبیت اپنے اندر نہاں رکھتی ہیں کہ ان کو پڑھکر وطن کی خدمت کا غیر فانی جذبہ بھڑک اٹھتا ہے۔ اقبال مسلمانوں کے مولانا محمد علی کے بعد واحد علمبردار تھے جس کا ثبوت اس سے ملت ہے کہ باوجود انکے کہ وہ اسقدر عالی دماغ اور مشرقی دنیا کے عدیم المثال شاعر تھے مگر نوبل انعام سے صرف اس لئے محروم رہے کہ اقبال کی اکثر نظمیں بین الاقوامی ہونے کے بجائے بین الاسلامی ہوتی تھیں۔

اسلام اور مادر وطن ہندوستان کو اقبال کی رہنمائی کی بڑی ضرورت تھی مگر افسوس کہ وہ ایسے پُرآشوب وقت میں ہم سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو گئے جب کہ قوم میں ان کا کوئی نعم البدل نظر نہیں آتا۔ اقبال کو محض ایک شاعر کہنا سخت غلطی ہے اُن کی شاعری ایک ضمنی چیز تھی۔ در اصل قدرت نے اقبال کو دنیا اور دنیا والوں کے لئے مجسمہ ہدایت بنایا تھا اقبال ایک اعلیٰ درجہ کے فلسفی، بلند پایہ ادیب اور دنیا کے بے لوث خادم تھے۔ ان کا مقصد دیگر افراد کی طرح صرف اپنا پیٹ پالنا ہی نہ تھا۔ وہ اپنے فلسفہ علم و ادب، شاعری غرضکہ تمام خوبیوں سے دنیا کی خدمت کرنا چاہتے تھے۔ وہ وحدت

کے تو ڈالے تھے اور چاہتے تھے کہ مسلمانوں کی ایک متحدہ قوت ہو اور وہ دنیا و آخرت کسی میں بھی کسی سے پیچھے نہ رہ جائیں رہا شاعری کا سوال تو وہ اپنے ساز دل کی آواز کو جو سوز میں ڈوب کر نکلتی تھی۔ شعر کا جامہ پہناتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انکی شاعری میں روح کی بیداری اور جوش عمل کا جس قدر سرمایہ موجود ہے اور کہیں نظر نہیں آتا۔ اور اقبال نے اپنا پیغام مسلمانوں کے پاس پہنچانے کا سب سے اچھا طریقہ یہی خیال کیا تھا۔

اقبال جذبات سے فوراً متاثر ہو جاتے تھے اور پھر خاموش نہ رہ سکتے تھے والدہ کا انتقال ہوتا ہے کس بے صبری سے اظہار کرنا چاہتے ہیں اور وقت کا مقتضا بھی یہی ہے لیکن صبر کے دائرے کو وسیع کرتے ہیں۔ اپنے خداداد فلسفہ سے اپنا جی بہلاتے ہیں اور غم کو ایک طویل داستان عبرت میں تبدیل کر دیتے ہیں۔

اقبال اہل وطن کو مکمل آزادی کا پیغام دینے آئے تھے انھوں نے یہ پیغام جس خوبی کے ساتھ ہندیوں کو دیا وہ یقیناً بصیرت افروز ہے اور اس پر عمل کرنے سے ہم ترقی کی شاہراہ پر آسانی سے گامزن ہو سکتے ہیں۔ سیاسی برین کی صف میں بھی اقبال کا درجہ بہت بلند ہے ان کے ہر شعر میں ایک حقیقت پنہاں ہوتی ہے اور زندگی کا کوئی نہ کوئی فلسفہ اس سے ضرور حل ہوتا ہے غیر مرئی واقعات کی مصوری اقبال کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔

اقبال صرف مسلمانوں ہی کو درس حیات نہیں دیتے تھے بلکہ ان کی شاعری میں قومی رنگ بھی پورے طور پر چھایا رہا ہے لیکن قومیت کے ساتھ مذہبیت کو بھی دخل ہے اس قسم کی شاعری کے اعلیٰ نمونے اقبال کے کلام میں اکثر پائے جاتے ہیں۔ مثلاً

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا ۔۔۔ ہم بلبلیں ہیں اس کی وہ گلستاں ہمارا

مذہبیت کا اقرار علی الاعلان کرتے ہیں اور مذہب کی صحیح حقیقت واضح کرتے ہوئے قوم کو اتفاق و اتحاد کی دعوت دیتے ہوئے یوں فرماتے ہیں۔

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا ۔۔۔ ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستان ہمارا

اقبال پر اعتراض کرنے والے حضرات یہ کہتے ہیں کہ وہ (۱) مذہب سے بے بہرہ تھے اور ان کے شعر عوام سمجھ نہیں سکتے جس کی وجہ سے خاطر خواہ فائدہ نہیں پہنچتا تھا

ان کی مذہبی حیثیت انشاءاللہ بعد میں واضح کروں گا۔ آیئے اس جگہ پر انکے سلیس اور عام فہم کلام پر بحث کریں۔ میں تفصیل میں نہیں جانا چاہتا، ایک مثال لیکر آگے بڑھتا ہوں۔

مادر وطن کے سر پر دستار فضیلت رکھتے ہیں اور اس کی پوزیشن واضح کرتے ہیں۔

اے ہمالہ اے فصیل کشور ہندوستاں ۔۔۔ چومتا ہے جھک کے پیشانی کو تیری آسماں
برف نے باندھی ہے دستارِ فضیلت تیرے سر ۔۔۔ خندہ زن ہے جو کلاہ مہر عالمتاب پر

لیکن طبیعت کو سیری نہیں ہوتی۔ مادر وطن کے لئے اپنے اسی فلسفہ کو سلیس کرتے ہیں اسی تخیل کو دوسری جگہ یوں ارشاد فرماتے ہیں۔

پربت وہ سب سے اونچا ہمسایہ آسماں کا   وہ سنتری ہمارا وہ پاسباں ہمارا

علامہ موصوف کے کلام میں حالی کے انداز بیان کا اثر زیادہ پایا جاتا ہے اس کا یہ مطلب نہیں کہ علامہ موصوف مولانا حالی کے مرہون منت تھے بلکہ ڈاکٹر اقبال نے حالی کی طرح اپنے کو بھی خدمت خلق کے لئے وقف کر دیا تھا لیکن اقبال کے فلسفہ سے اس کا رنگ دوبالا ہو جاتا تھا اور ان کے علم، قابلیت اور سیاست دانی سے ان کے کلام میں چار چاند لگ جاتے تھے۔

جس وقت علامہ نے شکوہ لکھا اسلامی دنیا میں ہلچل مچ گئی۔ فرشتے بھی تھرا گئے ایک طرف مسلمانوں کی غیر فانی خدمات کا اعتراف کرایا تو دوسری طرف انسان کو اس کی بداعمالیوں سے آگاہ کر کے صراط مستقیم پر چلنے کی ترغیب دی!

بیباکی اقبال کی سرشت تھی۔ خدمت وطن انکا نصب العین، علم فلسفہ سیاست دانی۔ لیاقت کا ایک سمندر تھا جس میں اقبال ہر وقت غوطہ زن تھا۔ اقبال دنیا کے لئے خضر راہ تھے۔ وہ ہمارے لئے شمع ہدایت تھے۔ اگر ایک طرف وہ علم کے بحر ذخار میں ڈوبے ہوئے تھے تو دوسری طرف عمل کے ہمالہ کی سب سے اونچی چوٹی اقبال کے پیروں تلے تھی۔ اقبال رفتار زمانہ سے بخوبی واقف تھے اور زمانے کے اس موجزن سمندر میں ہمارے لئے ناخدا تھے۔ وہ ہمیں بتاتے تھے کہ موجوں کا رخ اس طرف ہے۔ اس کے مخالف چلنے میں ہمارے لئے کیا کیا مصیبتیں تھیں۔ زمانہ کا سمندر یہاں گہرا ہے اور وہاں پایاب۔ کیونکہ وہ زمانے کے سمندر کو روند کر عبور کر چکے تھے۔ تڑپ تھا۔ کہ وہ ہمیں انھیں لوگوں کے صف میں کھڑا کر دیتے جو آزاد ہیں۔ آزادی کے متوالے ہیں اور آزادی کے لئے اپنی جانیں لڑا دیتے ہیں۔ لیکن آہ اجل نے ان کی زبان کو ہمیشہ کے لئے بند کر دی۔ آخر ان کی آن تھک کوششوں کا یہ نتیجہ نکلا کہ مشرق بھی مغرب کے دوش بدوش تنازع للبقا میں حصہ لینے لگا اور مشرق، گمنام و غلام مشرق آزادی اور ناموری کی اونچی چوٹیوں پر چڑھنے کی کوشش کرنے لگا۔

اقبال نے طلبا کو بھی درس حیات دیا ہے۔ دیکھئے کس قدر سادگی کے ساتھ تمام دنیا کی سیاست کا خاکہ الفاظ کے الٹ پھیر بنا کر پیش کرتے ہیں

خدا تجھے کسی طوفان سے آشنا کر دے   کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں
تجھے کتاب سے ممکن نہیں فراغ کہ تو   کتاب خواں ہے مگر صاحب کتاب نہیں

آئیے اب ہم آپ کو اقبال کی اس دنیا میں لے چلیں جو مذہبی دنیا کے نام سے موسوم ہے اور اسی دنیا کے وجہ نے اقبال کو نوبل انعام سے محروم رکھا۔ یہ دنیا چار دیواری تھی اقبال کے دل و دماغ کی۔ اقبال ہر چیز میں ہی

رنگ دیکھنا چاہتے ہیں وہ مشرق کو مغرب کی بنیاد سمجھتے ہیں۔ صبح کے اندر بھی مذہب ہی کی روشنی کارفرما معلوم ہوتی ہے۔ فرماتے ہیں

وہ سحر کا نیتاب ہے جس سے شبستانِ وجود
ہوتی ہے بندۂ مومن کی اذاں سے پیدا

اقبال خودی کے قائل تھے اُن کے خیال میں خودی کا مذہب میں بڑا ہاتھ ہے۔ اقبال نے اسی چیز کو دنیا کے سامنے پیش کیا اور دنیا نے خودی کے رتبے کو کسی حد تک سمجھ بھی لیا۔ فرماتے ہیں۔

ہزار چشمے تیری سنگِ راہ سے پھوٹے
خودی میں ڈوب کے ضربِ کلیم پیدا کر

اقبال نے خودی، بیخودی پر اپنا ایک دیوان الگ مرتب کرلیا۔ خودی کے مفہوم کو ایک جگہ یوں ادا کرتے ہیں

نہنگ زندہ ہے اپنے محیط میں آزاد
نہنگ، مردہ کو موجِ سراب بھی زنجیر

اقبال کا دل مذہبی جوش سے لبریز تھا۔ ایک جگہ تخیل کی بلندی ملاحظہ فرمایئے۔

یہ نغمہ فصلِ گل و لالہ کا نہیں پابند
بہار ہو کہ خزاں لا الٰہ الا اللہ

اگرچہ بت ہیں جماعت کی آستینوں میں
مجھے ہے حکمِ اذاں لا الٰہ الا اللہ

اللہ اللہ ایک مومن و کافر کا موازنہ کس خوبی سے ادا کرتے ہیں۔ یہ کسوٹی ہے جو بندہ مومن اس پر پورا اترے وہ یقیناً مومن ہے۔ فرماتے ہیں۔

کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے
مومن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہے آفاق

اتحاد

(جناب ماسٹر نصیر حسین صاحب خیالؔ)

تلے ہیں مٹانے پہ اغیار مسلم
ہو اب خوابِ غفلت سے بیدار مسلم

دکھا دے زمانے کو پھر زور اپنا
ذرا لے کے انگڑائی اک بار مسلم

نبی ایک قرآن ہے ایک پھر کیوں!
یہ آپس میں ہے بحث و تکرار مسلم

دکھا متحد ہو کے قوت کو اپنی
دہل جائے دنیا پھر اک بار مسلم

ترے پرتوِ حسن سے جگمگائے
عرب، ہند، ایران، تاتار مسلم

نہ ہو کارگر جس پہ دشمن کا حربہ
وہ بن متحد ہو کے دیوار مسلم

الٰہی مٹے اتحاد ان کو دیدے
ترے بیکسی کے ہیں غمخوار مسلم

ماتمِ اقبال!

(صہبا مدیر معارف)

ابھی صہبائے سخن سے نہ ہوئے تھے خارج | بزم میں اپنی نہ روشن ہی ہوئے تھے فانوس
ابھی زیبائشِ محفل میں کسر تھی باقی | ظلمتِ شب کے لئے ایک سحر تھی باقی
باعثِ کیفِ دوامی تھا جمالِ اقبال | ساری دنیا میں نہ تھا کوئی مثالِ اقبال
نہ ہوئے تھے ابھی منت کشِ شاعر النساں | ایک بیک ہند کی لہروں میں اٹھا اک طوفان

ناخدا کشتیِ قسمت کا نہ تھا آن کی آن
موت کی گود میں مبہوت پڑی تھی اک جان

قبر کی گود میں اقبال پڑا سوتا ہے | صفِ ماتم ہے بچھی، سارا جہاں روتا ہے
سیکڑوں جانیں بھی قربان ہوں اس غم میں اگر | نہ ملا ہے، نہ ملے گا ہمیں اس کا ہمسر!
سازِ اسلام پہ گایا تھا ترانہ جس نے | نئے عنواں سے اٹھایا تھا فسانہ جس نے
ہم کو پیغامِ حقیقت کا سنایا جس نے | روحِ اسلام سے گلشن کو بسایا جس نے
اس کی آواز تھی گویا کہ ندائے غیبی | اس کا ارشاد تھا در اصل صدائے غیبی
صدرِ محفل نہ ہو جب لطفِ سخن خاک نہیں | گل نہ گر زیبِ چمن ہو تو چمن خاک نہیں
گرمیٔ قلب کا سامان ہے اب بانگِ درا | بالِ جبریل سے معمور ہے، دنیا کی فضا
اب ہے تسکین کا سامان فقط ضربِ کلیم | نغمہ پردازِ حقیقت ہے گلستاں میں نسیم

موتِ اقبال نہیں مرگِ ادب ہے صہبا
چھٹ گیا ہم سے جو اقبال غضب ہے صہبا

تو نہیں بزم میں لیکن ہے تیری یاد ضرور | بہرِ تاریخ ہے ورد زباں "اے مغفور"

۱۳۵۶ھ

فلم ایکٹر بننے کا جنون

(صلاح الدین احمد انصاری سابق طالب علم اسکول ہٰذا)

سال گذشتہ ایسٹر کی تعطیل میں بمبئی جانے کا اتفاق ہوا ایک پارک کے قریب ایک گیسو دراز۔ لمبی داڑھی والے فقیر نے میرا راستہ روک کر کہا "بابو جی میں مسافر ہوں۔ مجھے آپ سے کچھ عرض کرنا ہے کیا آپ چند منٹ اپنے قیمتی وقت کے دے سکتے ہیں" میں نے اسے ایک پیشہ ور سائل سمجھ کر بے رخی سے جواب دیا "بابا مجھے معاف کرو میں خود بھی ایک مسافر ہوں" یہ کہتے ہوئے میں نے آگے قدم بڑھانا چاہا مگر فقیر نہایت بیباکی اور سرعت کے ساتھ میری جانب بڑھا اور میرا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ کر کہنے لگا کہ آپ چاہیں یا نہ چاہیں مگر میں آپ کو اپنی کہانی سننے پر مجبور کردوں گا" اس کی اس جسارت نے مجھے نہایت بدحواس اور محو حیرت بنا دیا۔ قریب تھا کہ میں اپنی امداد کے لئے کسی کو آواز دوں۔ کہ وہ میرے ارادے کو تاڑ گیا۔ بے ساختہ ایک قہقہہ لگایا اور میرے نام سے مجھے مخاطب کرتے ہوئے بولا کیا اب بھی تم مجھے ایک عیار سائل سمجھتے ہو؟" اس مرتبہ اس کی آواز کچھ مانوس سی معلوم ہوئی مگر حافظہ کے البم کی ہر تصویر دیکھ جانے کے بعد بھی میں نہ پہچان سکا کہ یہ شناسا بزرگ کون ہیں؟ میں اسی طرح مبہوت کھڑا تھا کہ دفعتہً اس کے ہاتھوں کو جنبش ہوئی اور اسکا چہرہ، مونچھ۔ داڑھی کی نقاب سے بالکل پاک ہوگیا۔ میں نے پہچان کر نہایت جوش اور تپاک کے ساتھ کہا "ارے بھائی امتیاز! تم بایں ہیئت کذائی یہاں کہاں؟ کیا تم نے سی۔ آئی۔ ڈی کے محکمہ میں ملازمت کرلی ہے۔ آخر یہ بہروپیے کب سے بن گئے؟ اس نے فاتحانہ انداز میں طنزاً کہا جاؤ اپنا راستہ لو۔ میں مسافر ہوں۔ مجھے معاف کرو" میں نے کہا میاں امتیاز میں اس سابقہ طرز عمل کے لئے بالکل معذور ہوں۔ میں کیا اگر تمھارے والدین بھی جنھوں نے تم کو خون جگر پلا کر اتنا بڑا کیا) اس بھیس میں تمھیں دیکھیں تو ہرگز نہ پہچان سکیں میرے اس جملے پر وہ بے اختیار رو دیا اور ایک آہ سرد بھر کر کہا "میں مدت سے کسی ہم جماعت کی تلاش میں تھا کہ اس کے ذریعہ سے اپنی عبرتناک سرگزشت اپنے عزیزوں اور دوستوں تک پہونچا سکوں تاکہ یہ میری برباد زندگی اگر میرے لئے نہیں تو انھیں کے لئے کارآمد بن سکے۔ مجھے امید ہے کہ میری زندگی کی یہ آخری آرزو تم ضرور پوری کردوگے۔ اچھا بھائی ذرا غور سے سنو!

ایک روز اسکول جاتے وقت راستے کے سینما میں کچھ غیر معمولی چہل پہل دیکھی میں نے ایک کے دفتر میں پوچھا کہ "کیا اس وقت کوئی شو ہوگا" جواب ملا کہ "ہاں ابھی ایک خاص شو دس بجے دن کو ہوگا"۔ اتفاق سے ایک چونی اس وقت میری جیب میں موجود تھی چنانچہ کتابیں ایک پان والے کی دکان پر یہ کہہ کر رکھ دیں کہ "بھیا ابھی آتے ہیں۔ دو منٹ میں" اور فوراً ٹکٹ لیکر گھس گیا۔ بھیڑ یا دھسان کے ساتھ سینما ہال میں۔ تیسری گھنٹی بجی۔ تماشا شروع ہوا۔ ایک بجے

ختم بھی ہوگیا۔ باہر ٹہل کر کتابیں لیں مگر سوال یہ پیدا ہوا کہ جاؤں کہاں؟ اگر اسکول گیا تو یہ پوچھا جائیگا کہ اتنی دیر تک کہاں تھے۔ اور اگر گھر جاتا ہوں تو پوچھا جائیگا کہ آج اسکول سے اتنی جلدی کیوں آگئے اس لئے میں قریب ہی ایک پارک میں جاکر لیٹ گیا۔ لیٹے لیٹے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ کیوں نہ میں بھی ایکٹر بنوں اور دوسرے ایکٹروں کی طرح شاہانہ زندگی بسر کروں۔ کم از کم آٹھ سو روپیہ تنخواہ ضرور ہی ملیگی پھر تو میں اپنے وقت کا نواب ہونگا۔ بمبئی میں ایک عالیشان کوٹھی اپالو بندر پر سمندر کے کنارے لوں گا۔ ایک بہترین موٹر بھی رکھوں گا۔ چار پانچ نوکر بھی ہونگے جب اس فلم کو جس میں میں ہیرو کا پارٹ کروں گا۔ ہندوستان کے مختلف شہروں میں دکھایا جائیگا۔ تو میری غیر معمولی شہرت ہو جائیگی بچے بچے کی زبان پر میرا نام ہوگا۔ ہر سوسائٹی ہر طالب علم کی بزم خاص میں میرا ہی ذکر خیر ہوگا۔ اخباروں فلمی رسالوں میگزینوں میں میری تعریفوں کا چرچا ہوگا۔ ہر اپٹوڈیٹ آدمی کے ڈرائنگ روم یا نشستگاہ میں میری تصویر کا ہونا فیشن میں داخل ہوگا۔ لوگ مجھ سے ملنے کے اشتیاق میں میری کوٹھی پر میلہ لگائے رہیں گے۔ اور میں نوکر سے کہلا بھیجا کروں گا کہ کہدو "صاحب ہیں نہیں" روزانہ مبارکباد اور تعریفوں کے اتنے خطوط آئیں گے کہ میں بغیر پڑھے ان کو ٹوکری میں ڈال دیا کروں گا اور میرا نوکر ایک آنے سیر کے حساب سے ردی میں بیچ دیا کریگا میں جہاں بھی جاؤں گا سر آنکھوں پر بٹھایا جاؤں گا۔ لوگ مجھ سے گفتگو کرنا اپنے لئے ایک فخر خیال کریں گے۔ محمد علی جناح اور جواہر لال نہرو سے بھی زیادہ تفصیل کے ساتھ پبلک مجھے جانے گی۔ جدھر نکلوں گا۔ لوگ آپس میں میرے متعلق چہ میگوئیاں کریں گے ایک دوسرے کو زبردستی پکڑ پکڑ میری طرف اشارے کر کے بتائیں گے کہ دیکھو فلاں ایکٹر یہی ہیں۔ فلاں فلاں تماشوں میں بہترین کام کیا ہے میرے موجودہ اسکول کے ساتھی جب مجھے سینما میں اسکرین پر دیکھیں گے۔ تب لوگوں سے فخریہ کہیں گے کہ "یہ تو میرے ساتھ پڑھ چکے ہیں۔ میں ان کو خوب اچھی طرح جانتا ہوں۔ میرے تو بہت گہرے دوست تھے" لطف یہ کہ جس نے مجھے صرف ایک بار دیکھا ہی ہوگا وہ بھی مجھے اپنا گہرا دوست بتانے کو تیار ہو جائیگا۔ غرض اس کے متعلق طرح طرح کے خیالات دماغ میں آتے رہے۔ میں نے سوچا کہ تجربے کے لئے پہلے خوب کثرت سے فلم دیکھنا چاہئیں اور اس میں ایکٹروں کی ہر نقل و حرکت پر غور کر کے اس کی مشق کروں۔ پھر ایکٹر بننے کی کوشش کروں ایک ذرا سی پریشانی اس بات سے ہوئی کہ سینما دیکھنے کے لئے اتنے پیسے کہاں سے آئیں گے لیکن فوراً ہی یہ بھی خیال آگیا کہ ہندی اردو گرامر۔ الجبرا وغیرہ کی غیر ضروری کتابیں سیکنڈ ہینڈ بک سیلر کے یہاں بآسانی فروخت ہو سکتی ہیں آخر کار اس خیال کو عملی جامہ پہنایا۔ اور ایک دن پھر سینما گیا۔ مگر جب گھر واپس آیا تو زبردست خبر لی گئی۔ لیکن میں بھی کب چوکنے والا تھا۔ میرے سر پر تو ایکٹر بننے کا بھوت سوار تھا چنانچہ پھر سینما جا دھمکا۔ مگر آج واپسی میں، میں نے ایک پیسے کی جلیبیاں لیکر جیب میں ڈال لیں۔ جیسے ہی گھر پہونچا۔ پوچھا گیا کہ "اتنی دیر تک کہاں تھے"۔۔۔ مونہہ سے کہا۔ محلے میں میلاد شریف تھا وہیں گئے تھے" اتنا کہنے کے بعد جلیبیاں نکال کر سامنے رکھدیں جلیبیاں

دیکھکر سب کو یقین ہوگیا اور ساتھ ہی ساتھ مجھے اس کی خوشی بھی ہوتی کہ لڑکا اب مذہبی باتوں میں دلچسپی لینے لگا ہے غرض میں یونہی نئے نئے پوز کے دکھا کر بار بار آئینہ دیکھتا رہا۔

جب سب غیر ضروری کتابیں اس کی نذر ہوگئیں اور نوبت ایک آدھ ضروری کتاب تک پہونچ گئی تو اسکول میں ماسٹروں نے خبر لینا شروع کی۔ اس وقت میں نے کتابوں کا بیوپار بند کردیا۔ مگر ہاں ایک دن جب خرچ سے بہت مجبور ہوا تو یہ ضرور کیا کہ فقیرے درزی کے یہاں کا مرغ چوری سے پکڑ کر قصاب کے ہاتھ نیلام کر دیا اور ان پیسوں سے کئی مرتبہ ٹھاٹھ سے تماشا دیکھا اور گھر پر آئینہ سامنے رکھکر ہر ایکٹر کی نقل کرتا رہا جب مجھے یہ یقین ہوگیا کہ میں اب ایکٹنگ کرسکتا ہوں۔ تو اس کی فکر پیدا ہوئی کہ بمبئی کا ٹکٹ کیسے کٹایا جائے کس طرح سفر خرچ کے لئے روپیہ جمع کیا جائے۔ آخر اس شوق نے مجھے دلوانہ بنادیا۔ اس کے لئے میں نے وہ سب کام کئے جو مذہباً و اخلاقاً گناہ کبیرہ سمجھے جاتے ہیں۔ بلا تکلف دوستوں کی جیبیں صاف کیں۔ لڑکوں کی کتابیں چوری کرکے فروخت کیں فیس کے روپیے غائب کئے۔ مگر پھر بھی مجموعی رقم پچاس روپیے سے زیادہ نہ ہوسکی اسی انتظار میں پہلی تاریخ آگئی۔ شام کو والد صاحب دفتر سے دو سو روپیہ تنخواہ کے لائے وہ انھوں نے میرے سامنے صندوقچے میں رکھ دیئے۔ جب رات کا کھانا کھاکر سب لوگ سوگئے تو میں نے نہایت ہوشیاری سے والد صاحب کے کنجیوں کا گچھا اپنے قبضہ میں کیا اور صندوقچے سے ایک سو روپیہ کے نوٹ نکال کر علی الصباح اسکاؤٹ ریلی کے بہانے سے گھر سے بھاگ نکلا۔ اب میں خوشی میں جامے سے باہر تھا۔ ایک خوشی تو ایکٹر بننے کی اور دوسری خوشی بمبئی دیکھنے کی۔ جو پوچھتا "کہاں جا رہے ہو" نہایت فخر کے ساتھ اکڑ کر کہتا "بام بے۔" آٹھ سو پچاسی میل لمبے سفر کو "وہ بیچارہ یہ سن کر رعب میں آجاتا۔ سٹیشن پر میں ادھر سے ادھر سوالیہ نشان بنا ہوا پھرتا اور وقت معلوم ہوتے ہوئے بھی خواہ مخواہ لوگوں سے بار بار پوچھتا کہ "بمبئی کی گاڑی کتنے بجے چھوٹے گی" ایک صاحب سے تو میں گھبراہٹ میں پوچھنے لگا کہ "کیوں جناب ۸ بجے والی گاڑی بمبئی کتنے بجے جائیگی۔" انھوں نے غور سے میری صورت دیکھی پھر فرمانے لگے کہ "کہاں تشریف لے جائیگا۔ آگرے کے ....."

میں نے بگڑکر کہا نہیں "میں بام بے جارہا ہوں" غرض میں سوا آٹھ بجے جی۔ آئی۔ پی میل سے بمبئی لدھ گیا

تمام راستہ بڑی بےچینی اور اضطراب سے کٹا۔ جی میں آتا تھا کہ پر لگ جائیں اور اڑکر بمبئی پہونچ جاؤں۔ آخر کار تیسرے دن صبح کو چھ بجے وکٹوریہ ٹرمینس بمبئی اسٹیشن پر گاڑی ایک جھٹکے کے ساتھ رکی۔ بمبئی کا پر رونق اور نظر فریب اسٹیشن دیکھکر آنکھیں کھلی کی کھلی ہی رہ گئیں۔ اسٹیشن کے باہر نکلا۔ بھیڑ اتنی کہ ایک قدم آگے بڑھانا دشوار تھا۔ لوگ طرح طرح کی بولیاں بول رہے تھے۔ ٹراموے کی گھڑگھڑاہٹ۔ بگھیوں کی کھما کھم آدمیوں کا مجمع اونچی اونچی عالیشان عمارتیں دیکھکر میں کچھ گھبرا گیا۔ اتنے میں کسی نے قریب آکر پوچھا "کوئی ہوٹل چلنا ہوگا سیٹھ صاحب" "ہاں" میں کہکر اس کے ساتھ ہولیا اور چرچ گیٹ محلے کے ایک ہوٹل میں ٹھہر گیا۔ دوسرے دن سے فلم کمپنیوں کی

خاک چھانتا شروع کی۔ جہاں جاتا موٹے موٹے حرفوں میں لکھا ملتا "نو ویکینسی"۔ اگر اس کے پڑھنے کے بعد بھی اندر گھسنے کی کوشش کرتا تو دربان بغیر سوٹ بوٹ کا خیال کئے ہوئے میرا شانہ اس طرح سے پکڑتا جیسے کہ مجھ سے اور اس سے باپ دادا کے زمانے سے دشمنی چلی آرہی ہے اور کہتا کہ "اندر جانے کا حکم نہیں" یہ کہکر میرا رُخ دوسری طرف کو پھیر دیتا۔ اور میں منھ لٹکائے قدم بڑھاتا ہوا اور چاروں طرف یہ دیکھتا ہوا کہ کسی اور شخص نے تو نہیں دیکھ لیا۔ دوسرا راستہ اختیار کرتا۔ آخر عاجز آکر یہ طے کیا کہ زبردستی کسی کمپنی کے اسٹوڈیو میں گھس جاؤں گا۔ چنانچہ ایک مشہور کمپنی کے اسٹوڈیو میں زبردستی گھسنے کی کوشش میں دربان جس شرافت سے میرے ساتھ پیش آیا اُس کا ذکر کرنا ہی فضول ہے ایک معمولی فلم کمپنی کے پروپرائٹر سے بڑی دقتوں سے ملاقات بھی ہوئی۔ مگر جب اسکو معلوم ہوا کہ میں صرف آٹھواں پاس ہوں اور فن موسیقی سے بھی بیگانہ محض ہوں تو اُس نے نہایت ترش روئی سے یہ کہا کہ میرے یہاں فلم ایکٹر گریجویٹ سے کم قابلیت کے نہیں رکھے جاتے آپ کسی نوٹنکی وغیرہ میں بھرتی ہونے کی کوشش کیجئے غرض یوں ہی دوڑتے دھوپتے کافی عرصہ گذر گیا لیکن ایکٹر نہ بننا تھا اور نہ بن سکا۔ جو کچھ روپیہ لایا تھا۔ اس آوارہ گردی میں ختم ہوگیا۔ ہوٹل والے نے سامان فٹ پاتھ پر رکھوا دیا جسے میں اٹھاکر ایک مسجد پہونچا۔ مسجد کے مُلّا کو جب یہ علم ہوا کہ میں فلم کمپنی میں نوکری کرنا چاہتا ہوں۔ تو اس نے مجھے مسجد میں بھی نہ ٹھہرنے دیا۔ اور میں بہ مشکل سامان اٹھاکر ایک پارک تک پہونچا۔ وہاں لیٹے لیٹے مجھے وہ دن یاد آیا۔ جب میں اسکول سے غیر حاضر ہوکر سینما دیکھکر ایسے ہی پارک میں لیٹا ایکٹر بننے کے متعلق خیالی پلاؤ پکا رہا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ وہ زمانہ بھی یاد کیا جبکہ بے فکری سے کھاتا تھا اور اسکول کے احباب کے ساتھ گلی ڈنڈا کھیلتا تھا اور زندگی کے لطف اُٹھاتا تھا۔

اس خانہ بدوشی کی حالت میں مجھے یہاں دو سال گزر گئے۔ جب ایک حبّہ میرے پاس باقی نہ رہا اور فاقوں پر فاقے کی نوبت پہونچ گئی تو جی میں آیا کہ خودکشی کرلوں، مگر اس خیال نے کہ خودکشی کی موت "حرام موت ہے" مجھے اس سے باز رکھا۔ میں نے چاہا کہ قلی کا کام کر کے اپنا پیٹ پالوں۔ مگر میرے بدن کی لاغری اور نزاکت کو دیکھکر کوئی مجھ سے بات تک نہ کرتا تھا۔ آخر مرتا کیا نہ کرتا۔ میں نے فلم ایکٹر بننے کے شوق میں "مجنون صفت"، "فقیر بننے" میں قدرے مہارت پیدا کرلی تھی اب اسی کو اپنا ذریعہ معاش بنایا صبح سے شام تک ؎

بناکر فقیروں کا ہم بھیس ہر دم   تماشائے اہل کرم دیکھتا ہوں

بھائی خدا سے دعا کرو کہ وہ مجھے اس بے حیا زندگی سے جلد نجات دے۔ میں نے کہا پیارے دوست! اب تمھاری مصیبت کا زمانہ ختم ہوگیا۔ اب میں تمھیں تنہا نہیں چھوڑ سکتا۔ آج ہی تم کو مکان واپس لے چلوں گا تمھارے ماں باپ تمھاری جدائی میں پاگل ہوگئے ہیں۔ اس نے آبدیدہ ہوکر کہا کہ میرے ماں باپ تو میری موجودگی میں بھی صحیح الدماغ نہ تھے ورنہ وہ میری ایسی ناجائز ناز برداریاں کیوں کرتے جنھوں نے سب مجھے

دین و دنیا کہیں کا نہ رکھا۔ یہ انھیں کی بے توجہی اور غفلت تھی جس نے مجھے آوارہ لڑکوں کے ساتھ پھرایا اور سینما دیکھنے کا موقع بہم پہنچایا۔ ہائے! اس وطن میں کیا منھ لیکر جاؤں کہ جس کا چپہ چپہ میری سیہ کاریوں سے داغدار ہے اور جس کا بچہ بچہ میری بد اعمالیوں سے واقف ہے۔ میں نے کہا کہ تمھارے والدین کی حالت نہایت قابل رحم ہے۔ کچھ بھی ہو میں تمھیں اپنے ساتھ ضرور لیجاؤں گا تم اب مجھ سے بھاگ کر نہیں جا سکتے۔ وہ سنجیدہ ہو کر بولا اچھا آؤ میں اپنا سامان جو اسی محلہ میں ایک شخص کے یہاں رکھا ہے لے لوں اتنا کہہ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا میں بھی اس کے پیچھے ہو لیا۔ محلہ کے اندر پہونچ کر اُس کی رفتار میں غیر معمولی تیزی پیدا ہو گئی اور وہ مجھ سے کئی گز آگے ہو گیا۔ یہاں تک کہ وہ تنگ گلی میں مُڑتے ہی میری نظروں سے بالکل غائب ہو گیا۔ اور باوجود انتہائی تلاش و تجسس کے کہیں اُس کا سُراغ نہ چلا!!!

غمِ اقبال

(شیخ یعقوب علی روشن صدیقی (مدیر معاون شعبہ انگریزی)

اسلام کا وہ روشن چراغ جو زمانہ کے تیز و تند جھونکوں سے مجھ گیا تھا اقبال تو اس کی آخری جھلملاہٹ آخری چمک تھا ایک مرتبہ بھڑکا اور گل ہو گیا۔ اور اب وہی تاریک رات ہے اور بلاؤں کا ہجوم!

"اقبال! ابھی ہیں تیری روشنی نے ہماری آنکھیں ضرور کھول دیں لیکن ہم اپنی منزل نہ دیکھ سکے! کیا واقعی اب تو ہماری اس دنیا میں کبھی نہ آئیگا؟ دیکھ ایسا نہ کرنا تو ہم کو اس بیچارگی کے عالم میں چھوڑ کر ہرگز نہیں جا سکتا! ہم سب کچھ دیکھتے ہیں مگر کچھ کر نہیں سکتے اکہ دل کی آخری دھڑکن پھر خاموش ہوتی جاتی ہے! دیکھ میں نے تیرے بزم تصور کے روشن کرنے کے لئے آسمان کے تارے جلائے ہیں جو میرے منتشر دل کی طرح بکھرے ہوئے ہیں کیا تو اب بھی نہ آئیگا!!!

ہاں! دعال کی خوشگوار راتوں کو چھوڑ کر اب تو ہماری اس اجڑی دنیا میں کیوں آنے لگا اب تو تو وہاں ہے جہاں سے بقول شاعر "آپ اپنی خبر نہیں ہوتی" لیکن کیا ہم اس نا امیدی پر بھی تیرا انتظار چھوڑ دینگے؟ نہیں! ہرگز نہیں! ہاں! تیرے قدموں کی آواز کے منتظر اور آنکھیں فرش راہ بنی رہینگی اور جبتک تو نہ آئیگا ہم تیری آمد کے منتظر رہینگے اور جب ہماری آنکھیں خود بخود بند ہونے لگینگی تو تیرا تصور ہمارے لئے خواب شیریں بنجائیگا جب ہمارے دلوں پر جمود کی کیفیت طاری ہو جائیگی غفلت اور خود فراموشی کی موجوں میں جب ہمارا سفینۂ حیات بہنے لگیگا ہم گم کردہ راہ ہو کر خضر منزل کی تلاش میں سرگرداں ہونگے اسوقت تیری نوائے درد "بانگ درا" بنکر ہمیں راہ راست دکھائے گی اور ہم جب عقل کے طلسم کدہ میں ہم گم کردہ راہ ہو کر مادیت کے بیابان میں بھٹکتے ہوں گے تو اس وقت تیری آواز یوں رہنمائی کرے گی ؎

گزر جا عقل سے آگے کہ یہ نور چراغِ راہ ہے منزل نہیں ہے

اقبال

(اختر عرفانی)

انیسِ ملتِ اسلام حسنِ بزمِ شہود
حکیمِ عقل و خرد، اے سلیمِ نظمِ وجود

معلمِ رہِ یزداں، سفیرِ راہِ عمل
خبیرِ فلسفہ حسنِ ذات، حسنِ ملل

خطیبِ منطقِ دینِ مبیں، حکیمِ عجم
فدائے مصحفِ خیر الانام، خیرِ امم

سخن شناس و سخن سنج و لازوال ادیب
رگِ حیات کا نباض، زندگی کا طبیب

آلِ زیست فقط ترجمانِ سرِ خودی
شہیدِ وضعِ قلندر، ادائے مطلبی

وہ جس کے نکتۂ دانش میں، دانشِ معبود
وہ جس کے ہر نظریہ میں عقلِ کل محدود

کبھی مقابلِ یزداں ہوا جو شکوہ طراز
بنا جو شانہ کشِ زلفِ قومِ شام و حجاز

فضائے دہر سے کھینچیں تجلیاں جس نے
سیاہیوں میں سمو دیں سفیدیاں جس نے

نگاہِ عام کو بخشی صلاحیت جس نے
دکھا دی صورتِ تعمیرِ شخصیت جس نے

وہ جس نے دیدیا مسلم کو اذنِ بیداری
وہ جس نے دیدیا مومن کو درسِ خودداری

اُچھالی جامِ سیاست سے تہ نشیں جس نے
نچوڑ لی خمِ ملی سے انگبیں جس نے

تعلقات کی راہیں تلاش کیں جس نے
سیاسیات کی زلفیں تراش دیں جس نے

نگارِ زیست کی شکلیں قرار دیں جس نے
ردائیں زنگِ عدم کی اتار دیں جس نے

جبینِ ذرہ پہ کی عکسِ مہر کی تنویر
اتار دی قطرے کے دامن پہ بحر کی تصویر

غرض عجیب ہے کچھ قصۂ سفیرِ عدم
"لطیف بود حکایت دراز تر گفتم"

اقبال کا پیغام

(جناب شوکت علی صاحب ایم اے۔ ڈیل ٹی صدر انجمن اردو ادب و مدیر شعبہ انگریزی مجلہ ہٰذا)

اقبال کی شاعری انقلابی ہے جس نے ہمارے، اخلاق، آداب، معاشرت، افکار، غرض کہ ہر شعبہ حیات پر ایک گہرا اثر ڈالا ہے۔ ان کے کلام میں جس قدر تنوع، جدت اور بلند تخیل ملتا ہے وہ کسی دوسرے مشرقی شاعر کے یہاں نہیں پایا جاتا۔ اقبال مغربی تہذیب اور سیاست کو جس کی بنیاد خودغرضی اور رقابت پر قائم ہے انسانیت کے واسطے مہلک سمجھتے ہیں۔ ان کے ذہن میں ایک ایسے عالم انسانیت کا تخیل ہے۔ جہاں مذہب اور اخلاق زندگی کا عنوان ہوں، جہاں مساوات، خودداری اور حریت لوگوں کی فطرت ثانیہ ہو، اقبال اسلام اور اس کے اصولوں کو انسانیت کے درد کا درماں بتاتے ہیں۔ درحقیقت اقبال کی حیثیت ایک معلم حقیقت نواز کی ہے جو شاعری کے ذریعہ دنیا کو اپنا پیغام پہنچانا چاہتا ہے۔ یہاں ہمارا مقصد، اس پیغام کے چند بنیادی عنوانات پر ایک سرسری نظر ڈالنا ہے۔

توکل مسلمانوں کے تنزل کا ایک بڑا سبب عشرت پسندی اور توکل کی غلط تفہیم ہے۔ ہادیٔ برحق نے قناعت و توکل کی جو تعلیم دی اس کا مقصد یہ ہرگز نہ تھا کہ انسان اپنی فطری قوتوں کو کام میں نہ لائے اور صرف قضا و قدر کے اصولوں پر نظر رکھے۔ برخلاف اُس کے اُس اعلیٰ تعلیم کا منشا یہ تھا کہ ہر امکانی کوشش کے بعد نتیجہ کو غیرفانی ہستی کے فیصلہ پر چھوڑ دیا جائے لیکن بدقسمتی سے آج مسلمانوں نے قناعت کو کاہلی کا مرادف سمجھ لیا ہے جس کی وجہ سے حیات اجتماعی کی بنیادیں کمزور ہوتی جارہی ہیں۔ ایک حق جو انسان کے نزدیک زندگی سعیٔ پیہم کا نام ہے۔ اس جہد کی نہ کوئی ابتدا ہے اور نہ انتہا۔ دیکھئے فطرت کے رازداں نے اس نکتہ کو کس انداز سے بیان کیا ہے ؎

اے کہ آسودہ نشینی لب ساحل برخیز — کہ ترا کار بگرداب و نہنگ است ہنوز
از سر تیشہ گذشتن ز خردمندی نیست — اے بسا لعل کہ اندر دل سنگ است ہنوز

مغربی تہذیب آج تمام دنیا مغربی تمدن کی ہمہ گیری کی وجہ سے مرعوب ہے اور اُس کے وجود کو مستقل تسلیم کرتی ہے عالم میں ہزاروں تمدن اور ہستیاں وجود میں آئیں۔ ایک خاص زمانے تک دنیا کی نظریں انکی ہمہ گیر تابندگی سے خیرہ رہیں۔ ہر ایک نے لا زوال اور غیرفانی ہونے کا دعویٰ کیا لیکن آج ان کے اثرات کہاں تک ہیں اور انجام کیا ہوا، اس کا جواب "فراعنہ مصر کی لاشیں، سکندر یونانی کی ہڈیاں، بابل کے کھنڈر، کلدانیا کے ویرانے، زار روس کے جسم کی تڑپ اور زندہ درگور قیصر جرمنی کے دل کی حسرتیں دینگی" آیئے ہم آپ کو

اس صحیفہ عبرت کی صفحہ گردانی کرائیں ؎

بگرداں جام و از ہنگامۂ افرنگ کمتر گو — ہزاراں کارواں بگذشت ازیں ویرانہ پے در پے

آج مغربی تہذیب کی مادی فائدہ رسانیوں سے کون انکار کرسکتا ہے علوم و فنون کی ترقی میں مغرب نے جو دماغ سوزیاں کی ہیں وہ ایک منصف مزاج شخص سے خراجِ تحسین وصول کئے بغیر نہیں رہ سکتیں، لیکن واقعات کا دوسرا پہلو بھی قابلِ ملاحظہ ہے۔ مغرب ارتقائے انسانی کے اس بلند درجہ پر پہنچنے کے باوجود وادیٔ ایمن کی روح پرور فضا سے ناآشنا ہے۔ اس کی مجلس میں انا الحق اور ربِّ ارنی کی صدائیں شرمندۂ معنی نہیں ہیں مغربی دنیا میں حرص و خود غرضی کو انسان کی زندگی کا حاصل سمجھا جا رہا ہے۔ اس کے نتائج ہم بین الاقوامی کشت و خون کی شکل میں روزانہ دیکھتے ہیں۔ ظاہر بیں نظریں ان حقائق کی اہمیت کے سمجھنے سے قاصر ہیں صرف وہی دل جو قضا کا راز داں ہے اس کی تہ تک پہنچ سکتا ہے ؎

از کلیسے سبق آموز کہ دانائے فرنگ — جگرِ بحر شگافید و بہ سینا نہ رسید

دیگر — من درونِ شیشہ ہائے عصرِ حاضر دیدہ ام — آنچناں زہرے کہ از وے مار ہا در پیچ و تاب

دیگر — قدحے خرد فروزے کہ فرنگ داد مارا — ہمہ آفتاب لیکن اثرِ سحر ندارد

علم و یقین علم و حکمت کی معراج کمالِ یقین ہے دنیا کی تمام بڑی تحریکوں کی کامیابی یقین ہی کی مرہونِ منت ہے وہ کیا چیز تھی جس کی بدولت ایک وحشی اور بادیہ نشین جماعت نے عالم کی ترقی یافتہ اور متمدن اقوام کو زیر و زبر کر دیا، علم بغیر یقین کے نوعِ انسانی کی رہنمائی نہیں کرسکتا، یقین کی وجہ سے دنیا میں وہ انقلابات رونما ہوئے ہیں۔ جو معجزہ سے کم نہیں، لیکن بسا اوقات، علم اور سائنس کی ترقی یقین کی قوتوں کو کمزور کر دیتی ہے جس کا نتیجہ اقوام اور افراد کی تباہی کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ اقبال کی دور رس نگاہیں اس حقیقت تک پہنچتی ہیں ؎

ہزار بار نکوتر متاعِ بے بصری — ز دانشے کہ دل او را نمی کند تصدیق

بہ پیچ و تابِ خرد گرچہ لذتِ دگر است — یقینِ سادہ دلاں، بہ ز نکتہ ہائے دقیق

سائنس و مذہب سائنس کے نظریئے سراب نظر کی سی نوعیت رکھتے ہیں۔ آج ایک نظریہ دنیا کے سامنے پورے جوش کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے منطق اور عقل کی برق پاشیاں اس کی اہمیت کو تسلیم کرا لیتی ہیں۔ زیادہ زمانہ نہیں گذرنے پاتا کہ ایک دوسرا عالم اُس کی تردید کا بیڑا اٹھاتا ہے، اور اپنی ذہانت سے اس طلسم کو توڑ دیتا ہے۔ ڈاردن کے نام سے کون واقف نہیں۔ انیسویں صدی کے آخر میں اس کے نظریہ ارتقا کو جس قدر مقبولیت حاصل ہوئی وہ بھی پوشیدہ نہیں لیکن آج اس کے بہت سے دعوے کامیابی کے ساتھ غلط ثابت

کردیے گئے ہیں۔ برخلاف اس کے مذہب اور اخلاق کے قوانین جہاں تیرہ سو سال پیشتر تھے وہیں آج بھی ہیں، انکی بنیادیں زندگی اور فطرت کے اٹل قوانین پر قائم ہیں۔ جب تک انسان کے پہلو میں دل اور اس دل میں طلبِ حق کی تڑپ ہے وہ نوعِ انسانی کی ہدایت کے لئے وقف رہیں گے ؎

زماں زماں شکند آنچہ می تراشد عقل بیا کہ عشق مسلماں و عقل زناری است

اسی نکتہ کو حضرت اکبر نے عجیب ندرت کے ساتھ بیان کیا ہے ؎

ہوس پرستوں کو کیوں یہ کہ ہے اِن انقلابوں کی کیا سند ہے اگر زمانہ بدل رہا ہے، بدلنے ہی کو بدل رہا ہے

انسان اکثر اپنی ناکامیوں کو ابنائے زماں کی سرد مہریوں کا نتیجہ سمجھتا ہے، لیکن ناکامی کی وجہ دوسروں کی بے التفاتی نہیں بلکہ اپنے ہی نقطۂ نظر کی خامی ہوتی ہے۔ دل اور ارادہ کی تبدیلی دنیا میں انقلاب پیدا کرسکتی ہے اس میں جماعت کی قلت اور کثرت بے معنی لفظ ہیں لیکن ایمان براہیمی شرطِ اول ہے ؎

بخود نگر گلہ ہائے جہاں چہ میگوئی اگر نگاہ تو دیگر شود جہاں دگر است

خودی خودی اقبال کی شاعری کا خاص موضوع ہے انھوں نے اپنے مخصوص شاعرانہ انداز میں اس فلسفانہ حقیقت کو جس طرح بیان کیا ہے اُس کی نظیر دنیا کی شاعری میں نہیں مل سکتی۔ چنانچہ فرماتے ہیں ؎

خودی را حق بداں باطل مپندار خودی را کشت بے حاصل مپندار

دیگر

خودی چوں پختہ گردد لازوال است فراق عاشقاں عین وصال است

چیست مردن از خودی غافل بودن تو چہ پنداری فراقِ جان و تن

از خودی اندیش و مردِ کار شو مردِ حق شو حاملِ اسرار شو

خودداری دستِ سوال دراز کرنا خودکشی کا مرادف ہے خواہ اس کی نوعیت سیاسی ہو یا ذہنی اور تمدنی احساس خودداری کے بغیر کسی قوم یا فرد کا ابھرنا ناممکن ہے یہی وہ شریف جذبہ ہے جو زندہ اور مردہ قوموں میں امتیاز پیدا کرتا ہے اقبال نے اس حقیقت کو مختلف پہلوؤں سے بیان کیا ہے ؎

در جوے روانِ ما بے منت طوفانے یک موج اگر خیزد آں موج ز جیحوں بہ

دیگر

مسلم استی بے نیاز از غیر شو اہل عالم را سراپا خیر شو

پیش منعم شکوۂ گردوں مکن دست خویش از آستیں بیروں مکن

اسلام اور قومیت۔ اسلام دنیا میں رنگ اور نسل کے امتیازات مٹانے آیا تھا، ملت اسلامیہ احمر و اسود، ترک و افغان، ہندی اور چینی، عربی اور عجمی کی تخصیص سے اعلیٰ و ارفع ہے تمام کلمہ گو ایک سلک اخوت کی کڑیاں ہیں ہماری جماعت میں رکنیت کی شرط ثروت و افلاس، عبدیت و حریت، رنگ و نسل نہیں۔ بلکہ خدا کے آخری پیغام پر ایمان ہے

یہی وہ اصول تھا جس نے چرواہوں کو عالم کا سلطان بنایا۔ یہ اصول ابتدا سے اسلامی زندگی کے اجتماعی ارتقا کا سنگِ بنیاد رہا ہے، اسلامی سلطنتیں بنیں اور بگڑیں لیکن اسلامی ہمدردی کا یہ جذبہ ہمیشہ کارفرما رہا ہے۔ آج اس تنزل کے زمانے میں بھی ہم اس کے روح پرور نظارے دیکھ چکے ہیں لیکن مغربی قومیت کا تخیل جس کی بنیاد دوسروں سے نفرت اور ان کی تخریب پر قائم ہے اور جس کی وجہ سے اقوام عالم میں رقابت کے جذبات موجزن ہیں۔ اخوت اسلامی کے اس درخشاں اصول کو کمزور کر رہا ہے ملت کو ضلالت سے نکالنے کی غرض سے شاعر نے قوم کو ایک دعوت دی ہے، یہ کوئی نئی دعوت نہیں ہے بلکہ اتنی ہی قدیم ہے جتنا کہ اسلام، لیکن بدقسمتی سے آج ہم اس کو اپنے داغوں سے محو کر چکے ہیں ؎

نہ افغانیم و نے ترک و تتاریم　　چمن زادیم و از یک شاخساریم
تمیز رنگ و بو بر ما حرام است　　کہ ما پروردۂ یک نوبہاریم

دیگر

می نگنجد مسلم اندر مرز و بوم　　در دلِ اُو یادہ گیر و شام و روم
دل بدست آور کہ در پنہائے دل　　می شود گم ایں سرائے آب و گل

زندگی سعیٔ پیہم کا نام ہے زندگی کی کامیابی مستقل اور پیہم کوشش کی مرہونِ احسان ہے، اتفاقات سے قطع نظر دنیا کی تمام مفید تحریکیں انسان کی جانفشانی کی شاہد ہیں استحکام ارادہ اور ثبات عزم ہی ایسی چیزیں ہیں جو اقوام کے وجود کو تنازع للبقاء میں قائم رکھ سکتی ہیں۔ تاریخی واقعات کی تفصیل ہمارے موضوع سے خارج ہے، لیکن تاریخ کا خلاصہ یہی ہے کہ جفاکشی اور کامیابی مرادف الفاظ ہیں۔ آرام طلبی اور دولت کے نشہ نے ملت بیضائی سیاسی اور اجتماعی زندگی کو برباد کیا اگر آج ہماری قوم شاہراہِ ترقی پر گامزن ہونا چاہتی ہے تو اس کو یہ اصول کہ زندگی کا راز مسلسل جدوجہد میں مضمر ہے پیش نظر رکھنا پڑے گا ؎

میارا بزم بر ساحل کہ آنجا　　نوائے زندگانی نرم خیز است
بدریا غلط و با موجش در آویز　　حیات جاوداں اندر ستیز است

دیگر

دوامِ ما ز سوزِ ناتمام است　　چو ماہی جز تپیدن، بر ما حرام است
مجو ساحل کہ در آغوش ساحل　　تپید یک دم و مرگ دوام است

دیگر

سکندر با خضر خوش نکتہ گفت　　شریکِ سوز و سازِ بحر و بر شو
تو ایں جنگ از کنارِ عرصہ بینی　　بمیر اندر نبرد و زندہ تر شو

دیگر

زندگی در جستجو پوشیدہ است　　اصل اُو در آرزو پوشیدہ است
آرزو را در دلِ خود زندہ دار　　تا نہ گردد مشت خاک تو مزار

یادِ وطن

(جناب شفیق احمد صاحب قدوائی اسسٹنٹ ماسٹر اسکول ہذا)

یاد میں وہ دن بھی تجھ کو یا نہیں ہندوستاں! — لرزہ بر اندام تھا ہیبت سے جب تیری جہاں
وسعت عالم میں روشن تھا تو مثل کہکشاں — دم بخود تھا دیکھ کر عظمت کو تیری آسماں
تو کبھی خلد بریں تھا تاجداروں کے لئے
رشک سوئزرلینڈ تھا اپنی بہاروں کے لئے

وہ وفائے رام و سیتا وہ ادائے نل دمن — محو حیرت تھا جسے خود دیکھ کر چرخ کہن
کس قدر شاداب تھی پھولوں کی تیری انجمن — اک بہار بے خزاں تھا تیرے پھولوں کا چمن
سچ بتا ساقی ترے مے نوش سارے کیا ہوئے
جن سے لرزاں تھی زمیں وہ جوش سارے کیا ہوئے

تو تو سب کچھ تھا مگر اگلی سی اب شوکت نہیں — پھول کھلتے ہیں مگر پھولوں میں وہ نکہت نہیں
اے زمین ہند تجھ پر کون سی آفت نہیں — رہنے والے ہیں وہی لیکن وہ اب صورت نہیں
پھوٹ ایسی پڑ گئی ہے کچھ دلوں میں آجکل!
غیرت قومی نہ ہونے سے گئی صورت بدل

لٹ گیا سارا وطن لیکن نہیں تم کو خبر — دیکھتے ہی دیکھتے بس کھا گئی کس کی نظر
آشنائے درد ہو جائیں اگر قلب و جگر — سامنے آجائے آنکھوں کے ابھی روئے ظفر
ملک اپنا ہو رہا ہے ایک لاش بے کفن
مر چکے ہیں نام کو زندہ ہیں بس اہلِ وطن

ہے عزیز اپنے وطن کی گر تمھیں کچھ آبرو — ہند پر بڑھ کر بہا دو اب رگ جاں کا لہو
چھوڑ دو فرقہ پرستی ہے بہت ہی بد یہ خو — گر تمھیں آزاد ہونے کی ہے کچھ بھی آرزو
خود پرستی خود ستائی موجب راحت نہیں
خواب غفلت میں پڑے رہنے کی اب صورت نہیں

Swastika

Amir-ud-daula Islamia High School Magazine

اطلبوا العلم ولوكان بالصين

SEEK KNOWLEDGE EVEN THOUGH IT BE IN CHINA.
(Prophet Mohammad.)

IQBAL NUMBER.

LUCKNOW - - OCTOBER 1938

LIBRARY
Acc. No. 1026

Patron:— Mohammad Abdul Hai, *Head Master.*

Editorial Board:— Shaukat Ali, *Editor-in-Chief & Editor (English Section)*

Arshi, *Editor (Urdu Section.)*

Anwar Ahmad, *Publisher.*

Sh. Yakub Ali Siddiqi, *Joint Editor. (English.)*

Sharafat Ali Syed, *Joint Editor. (Urdu.)*

ANNUAL Re. 1. SINGLE COPY As. 10.

CONTENTS.

			Page.
1.	Editorial Notes ...	...	1
2.	Weakness in Mathematics ...	S. A. Husain ...	5
3.	The Importance of Vocational Education in Schools ...	Iradat Husain Kidwai B. Sc., B. T. ...	7
4.	The School Bell ...	Yakub Ali Siddiqui ...	9
5.	A Glance at Iqbal ...	Sd. Mohd. Ahmad ...	10
6.	Ideal of A Happy Life ...	Sharafat Ali Syed ...	11
7.	Wonders of Science ...	I. B. Gupta, B. Sc., A. T. C. ...	13
8.	Wars ...	Hasan Kamal ...	15
9.	The Nature of the State ...	R. K. Islam, M. A., B. T. ...	17
10.	Grains of Knowledge ...	Yakub Ali ...	21
11.	Cupid's Victim ...	Fareed Ahemad Siddiqui ...	22
12.	Iqbal & Nationalism ...	Syed Iltifat Husain B. A. ...	23
13.	A Tragic Story ...	Zahir Mohammad ...	28
14.	Value of Time ...	Syed Mohd. Waqif Rezvi ...	29
15.	Necessary for Health ...	Zulfequr Ali Siddiqui ...	30
16.	Alphabetical Enigma ...	Salahuddin Ansari ...	30
17.	Respect ...	S. A. Ansari ...	30
18.	Science and Human Progress ...	Ahemad Habib ...	31
19.	Riddles ...	...	31
20.	Kamal Ataturk ...	Shoukat Ali, Editor ...	32

فہرست اردو سیکشن

۱	سرِ آغاز	اڈیٹر	۱
۲	یادِ اقبال	جناب سید نواب علی صاحب ایم اے	۵
۳	کلماتِ انوراعی	اڈیٹر	۶
۴	"پس چہ باید کرد اے اقوام شرق"	جناب سید نواب علی صاحب ایم اے	۷
۵	آہ اقبال	مولانا ظفر علی خاں صاحب	۱۰
۶	پیام اقبال کے آہنی دور	سراج احمد صاحب علوی ایم اے	۱۱
۷	زندگی	جناب صہبا لکھنوی مدیر معاون	۳۰
۸	اقبال علیہ الرحمۃ	اختر عرفانی صاحب	۳۱
۹	اقبال اور طالبعلم	صہبا لکھنوی	۳۵
۱۰	اقبال کی شاعرانہ حیثیت	محمد ذوالفقار علی صدیقی متعلم درجہ دہم	۳۸
۱۱	غزل	یعقوب علی روش صدیقی متعلم درجہ دہم	۴۰
۱۲	محبت	محمد الیاس صدیقی متعلم درجہ دہم	۴۱
۱۳	زبان اور روحانیت	مولانا اشرف حسین صاحب	۴۳
۱۴	رباعی	اڈیٹر	۴۵
۱۵	تعلیم ریاضی کا اصل مقصد	سید شہنشاہ حسین طالبعلم درجہ ہشتم	۴۶
۱۶	بد نصیب انسان	فلک سروش	۴۷
۱۷	گلہائے نعت	شفیق الرحمن- متعلم درجہ ہفتم	۴۸
۱۸	اقبال میری نظر میں	جلال الدین صدیقی متعلم درجہ ایم اے	۴۹
۱۹	انجان	نصیر حسین صاحب خیال	۵۲
۲۰	ماتمِ اقبال	صہبا مدیر معاون	۵۳
۲۱	فلم ایکٹر بننے کا جنون	صلاح الدین احمد انصاری	۵۴
۲۲	غمِ اقبال	یعقوب علی روش صدیقی	۵۸
۲۳	اقبال	اختر عرفانی صاحب	۵۹
۲۴	اقبال کا پیغام	شوکت علی صاحب ایم- اے- ایل- ٹی مدیر شعبہ انگریزی	۶۰
۲۵	یادِ وطن	شفیق احمد صاحب قدوائی	

LITERARY ASSOCIATION A. ISLAMIA HIGH SCHOOL.

"NEW MINISTRY"—1938-39.

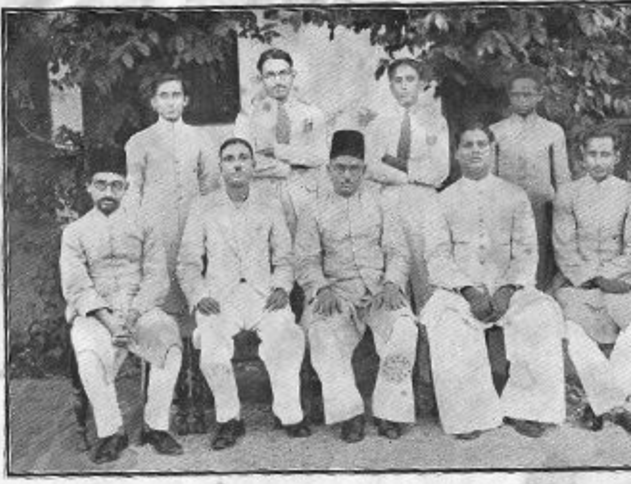

From left to right:—

Sitting:—Mr. Arshi, (*President, Mushaira and Editor Urdu*), Mr. I. B. Gupta-(*Treasurer*), Mr. Abd
Mr. Shaukat Ali, (*General President and Editor-in-Chief*), Mr. Anwar Ahmed Alvi, (*Libr*

Standing:—Mr. Sharafat Ali Syed (*Joint-Editor Urdu.*), Mr. Kaisarul Islam (*President, Debating S*
... Mr. Gulam Rabbani (*Joint-Secret*

THE IQBAL ACADEMY [redacted] LIBRARY Book No.

Amir-ud-daula Islamia High School Magazine, Lucknow.

Vol. 2.] SEPTEMBER, 1938. [No. 1

EDITORIAL NOTES.

We have entered the second year of our life. The warm reception of our modest journal has been quite encouraging but, however, this has not made us forget our shortcomings which, we are trying our best to overcome. The journal, we feel, has satisfied a long felt need, and it can be safely said that it is destined to play an important role in raising the intellectual standard of our students.

Iqbal Number.

The encouragement that we have received from our authorities, staff, students, and old boys has been so overwhelming that we have been immensely helped to undertake the publication of a special number, devoted to the life works, and teachings of the late Sir Mohammed Iqbal. Publication of special numbers has become a craze with modern journalism; but there are occasions when such an undertaking becomes a literary necessity. Our object, therefore, is to satisfy a literary want and to establish a healthy tradition for our magazine.

Iqbl's death has removed from our midst a personality who exercised unbounded influence upon our society. We feel, that it is high time to review his message and art and to introduce the new generation to his genius. Iqbal is really a poet of Islamic renaissance and an interpreter of modern thought. He has always challenged false standards, and has put optimism and practical achievement in the fore-front of his message. Iqbal imagines of a world where morality and religion are at their best. He, therefore, finds his ideal age in the early days of Islam. His ideal heroes are the blessed companions of our prophet. He earnestly pleads to recapture their simplicity, courage, honesty, justice and invincible faith in God. This characteristic

Islamic tendency of his poetry makes the number of his readers somewhat limited, but the quality of his genius and superb craftsmanship will always suffice to silence his biased critics. There are certain persons who fail to appreciate Iqbal; just because they cannot associate themselves with his religious and political ideas. This means carrying prejudices into the sphere of art and literature. To those who approach him with an open mind, Iqbal will always remain as one of the greatest poets of the world; and, certainly, the hitherto greatest Indian Muslim poet. He has elevated the entire tone of our literature and in the words of a great critic, "India and the world of letters are poorer for his death, the richer by what he has written." May his soul ever rest in peace.

Admissions.

This year was a great rush for admissions. All the available vacancies were filled up within a very short time. Many students, due to the insufficiency of accommodation, were refused admissions, and many Muslim guardians were thus unavoidably disappointed.

We cordially welcome all the old and new students to the portals of our school, and wish them a successful and happy session. Henceforward, they have become the members of an important school community having noble traditions. This gives them certain privileges, as well as, places great responsibilities over their shoulders. We expect them to live upto the ideals of their religion, and thus prepare to serve their community and motherland. They should cultivate the habits of discipline and hard work, which are necessary for success in this age, when survival of the fittest is the order of the day. We ask them to be noble Muslims and to take pride in their glorious past. To create the spirit of self-reliance in themselves should be their task. Ideals of plain living and high thinking should be put into practice by them. They should be conscious of the fact that they are the citizens of to-morrow and the custodians of a rich cultural and religious heritage.

Election.

We have been so busy with admissions etc; that proper atmosphere for carrying on literary activities has not yet been created. The only important activity during this yearly part of the session has been the election of new ministry. An election is always a lively affair, but this year it was specially

so. Brisk convassing was carried on. There was keen competition for the office of Secretary and Joint-Secretaryship.

We extend our hearty welcome to the new ministery and expect model work from them. We also fully sympathise with the unsuccessful candidates, and expect whole hearted co-operation from them. The election is over, and let us throw all differences, if any, to the wind and try unitedly to promote the welfare of the school community.

The following have been duly elected as the office-bearers of the Literary Association for the session 1938-39

Saukat Ali (General President, and Editor, English Section.)
Mr. R. Islam (President, Debating Society),
Mr. Arshi (President, Mushaira Society, and Editor Urdu Section.)
Mr. I. B. Gupta (Treasurer),
Mr. Anwar Ahmed (Librarian and Publisher),
Mr. Yakub Ali Siddiqi (General Secretary and Joint-Editor),
Mr. Ghulam Rabbani (Joint-Secretary) and
Mr. Sharafat Ali (Joint-Editor).

The following is the list of elected class represntatives:

X A.........Mr.	Riazunddin.	X B.........Mr.	Mohd. Ilyas.
IX A......... „	Fasih Alam.	IX B......... „	Mushtaq Ahmed.
VIII A......... „	Rahamat Ullah.	VIII B......... „	Abdul Waheed Khan
VII A......... „	Saeed Khan.	VII B......... „	Siddque Asharaf.
VI A......... „	M. Siddique.	VI B......... „	Saeed Akhtar.
V A......... „	Salem Khan.	V B......... „	[illegible]ir Ahmed.

Monitors.

We extend our cordial welcome to the newly elected monitors and wish them a happy term of office. Their responsibilitis in maintaing school discipline are great, and we hope that they would discharge their duties efficiently and conscientiously.

Two Distinguished Visitors.

Under the auspices of our school union two very interesting lectures were delivered on the 15th August '38, by Miss Snehlata Pradhan and

Mr. M .L. Shah of Bombay .Both of them are well known figures and have presided at the annual sessions of the All India Student's Conference, held recently at Lucknow. Mr. Shaw advised the students to take lively interest in politics without involving themselves in its practical aspects. Miss Pradhan spoke on the necessity of establishing democratic institutions in schools, and exhorted the students to organise themselves.

The function was an absolute success and ended with light refreshments.

Farewell

It would be extremely ungrateful on our part, if we fail, to thank Messrs. R. K. Islam. Arshad Mahmud and Muhtashin Uddin, the retiring editors. We are specially thankful to Mr. R. K. Islam, editor of the English section. It was, to an extent, due to his untiring efforts and Catholic spirit of co-operation, that we succeeded to bring the English Section to a high literary standard. The editorial columns of our back numbers bear an eloquent testimony to the flow and versatility of his pen.

Once more, we extend our hearty thanks to the retiring editors and to all contributors who helped us in conducting the magazine.

New Members of the Staff.

We congratulate Mr. Irradat Hussain, B.Sc., B. T. on his being appointed as a senior member of our staff. He has been serving our institution for a number of years; but it is only recently that he has permanently joined us. He is an able and conscientious teacher. It is also a matter of great joy that Mr. Anwar Ahmed Alavi, an old and popular member of our staff, has been promoted to senior grade. Mr. Anwar is a serious scholar of history and has several original works to his credit.

We also congratulate Mr. Tahir Hussain who has joined the clerical staff of our school. He is a hard working, experienced and courteous young man.

WEAKNESS IN MATHEMATICS.

By S. A. HUSAIN.

The idea in writing these lines is to secure the cooperation of the guardians in waging a crusade against the horror of mathematics, set deep into the hearts of their boys and wards. My suggestions are primarily meant for my pupils and secondarily extend to their parents also. What I have been stressing from time to time in classroom is being put in black and white, in order to throw out such hints, as may effectively give them directions, and they may be able to achieve that which fond hopes of their parents anticipate for them, as well as the ideal they themselves may have in mind.

I think it necessary that I should *clarify certain terms* which will subsequently be used in the course of this article, so that their sense and meanings may be clear to us at the very outset, and the object of my theme may not be lost sight of in the popular meanings that these terms generally convey to us.

Study:—When a boy works in a school he is supposed to study—I wish he were! Reading a few pages of text books, working out a number of mechanical sums from an Arithmetic or Algebra, learning by heart theorems from a text book of Geometary—all this is believed to be study. It may be anything, but it is *not even the shadow* of what is comprised in the word 'Study.' *Study implies* (1) Attention (2) Judgment and (3) Inference.

A doctor studies his patient. He attends on him. He uses his judgment and prescribes. A Vakil also studies a case of his client. A mechanic studies a machine brought to him for repairs. A Businessman studies the market, and a politician the situation. *Study is really the key of success in life.* To study lesson, therefore, should mean that one thinks over what is known to him and uses his judgment to pass to the unknown, and every bit of information thus obtained should be utilised as the data for some inferences which will have to be discussed whith the teacher.

Student:—Any boy or girl who is admitted in a school is commonly called a student. But it is a misnomer. My own conception of a student is something higher than this. The qualification of a student should be that *he studies* and not merely prepares his daily lessons. He should not be a mute recepient of the lectures of his teachers, but he should *intelligently reflect* over that which is taught to him and discuss with the teacher. How few are those that are fit to be called students! I wish my boys to be students both in spirit and letter, I do not want them to be '*Time-killers.*'!

Teacher:—Any person who is entrusted with the task of teaching in a regular school, goes by the title of a teacher. But a teacher according to my belief is one who *studies his pupils*, and tries to understand them, such that they may *ultimately turn to be real students.* I will again return to the Doctor and the Patient. A Doctor studies his patient. He prescribes and carefully marks the improvement in his patient, and as soon as he is fit again, the Doctor has done his duty. And similarly a teacher should know the condition of his alumni. He should not so much teach as *guide them*, and then leave them fully equipped to carve out their own destinies.

Educated:—The application of this word has also been exaggerated. Any erudite with extensive and intensive studies, capable of applying his knowledge to practical problems

of life can be called an educated person. I think there are two propositions which seem to be correct beyond any doubt.—

(1) All educated persons are literate.

(2) All educationists are educated.

But in practical life we find that two illogical converses of these two propositions have been blindly held as arguments: Illogical Converse Propositions.—

(1) All literate persons are educated.

(2) *All educated persons are educationists.*

It is this latter converse which is highly dangerous, and has blocked the advancement of education as well as has marred the progress of students. It is perhaps a much more serious blunder than taking a Compounder to be a Doctor. I have *invariably come across* guardians who have unhesitatingly spoken with authority on Education, although they were completely ignorant of even A.B.C. of Education.

The educated masses are generally *ignorant of the progress made* in Education, and it is a sad state of affairs that every Dick, Tom and Harry should be supposed to be an Educationist. Education cannot be achieved easily, and in view of it only a few teachers can be called to have acquireds education.

Specialisation:—In recent years good deal of progress has been made in the pedagogy of education. The problems of education in recent years have become very complex, and *the public* is *in the dark* about the strides made in this field of knowledge. The methods of teaching various subjects have been given to specialisation and we find specialists in every subject.

It is not very long ago that a Doctor could be thought to deal with all kinds of ailments, and was supposed to know all the branches of anatomy equally well. But gone are the days when this argument held any water. Now we have specialists in every branch, because the science has progressed enormously, and in our short life we cannot master the entire subject. Nobody would now care to consult an Eye-Specialist in a case of Pneumonia. We have our *specialists in Education* and the public should consider this fact carefully.

It may be that 20 years ago a trained teacher could deal with all the subjects, but now we have different specialists for different subjects, and a specialist in one branch cannot satisfy the wants in all the branches of studies. I would, however, concede one point in this connection,—that there are some common topics on which every trained teacher could say something with more or less an authority, just as there are some general principles of sanitation and hygiene weich every doctor is expected to know.

Causes of Weakness in Maths.—Now I would turn to my own subject and deal with reasons that have caused weakness in mathematics amongst the students.

It is an admitted fact that *majority of the boys hate* this subject and show no aptitude for it, but it can not be said that this disgust is anything-in born in all the cases. The eminent educationists have laid down *three causes*:—

(1) Of the total number of boys who are weak in mathematics not more than 5% are *mentally unfit* to learn mathematics.

(2) and (3). Of the remaining 95% some are weak due to *bad foundation and defective teaching* in the beginning, and the rest are weak because of *irregular habits*. The ratio among the two types of boys varies from country to country and school to school.

My eleven years experience in Islamia High School has led me to believe that 60 % are weak due to bad foundations and 35 % on account of irregularity. I think the former group also lacks in the correct attitude of studentship and their aversion sometimes leads them to become irregular in the study of mathematics such boys become conscious of their weakness, which tends to result in accelerating their disappointment, and *their despair increases* with the rise in higher classes. They feel that they can not pull themselves along with the class and a feeling of inferiority sets in, and they begin *to invent excuses* for the plight in which they have been thrown. Their patent charges are—(1) The teacher's standard is very high. (2) The teacher has no sympathy with the weaker boys. (3) The teacher is lazy and tries to shirk his duty. (4) The teacher does not know how to set a paper. (5) He awards marks under the influence of his 'Idea.' (6) His method of teaching is defective, (7) He goes very fast, and so on and so forth.

The only remedy to meet the situation is often thought to be the appointment of a *Private Tutor*, and if they could not afford to indulge in this *useless luxury*, they try to chalk out a *self made scheme* of their own and quite different from the one followed in the class. They are misguided by the false satisfaction that they are carrying on *independent study* and that their work would lead to make up the difficiency, and bring them to the level of the class by the time of their examination. But this pious hope is seldom realised!

Worse is the fate of those who engage a private tutor and about it I will say at length in my next article.

(To be continued.)

The Importance of Vocational Education in Schools.

By IRADAT HUSAIN KIDWAI, B. SC., B.T.

The importance of vocational education, it is true, is being realised in India in recent days. After a long time, it is now being felt that our present system of education is not only defective but it is also a waste of time, energy and money. It is a unanimous cry from every public platfrom, and from the gatherings of anxious guardians and social conferences that our present system of education needs a thorough overhauling. Even the official guardians of education show willingness to change the stereotyped Curriculum. Best minds of India, the responsible heads of higher education and the experienced educationists are busy in planning new schemes which may provide ample scope for vocational training. But all this uproar and agitation is only with one and one object in view and that is of solving the problem of increasing unemployment amongst the young generation. In fact the real educational value of the vocational education is not still contemplated and I am afraid that in our new curriculum this phase of education may not find an adequate place. In this short space I shall endeavour to mention the manifold advantages of vocational education, so that considerable emphasis be laid on this important branch of education. My reasons to lay a greater emphasis on this vocational training briefly are:—

(1) This is the age of democracy, and in democratic communities there is an increased

esteem of whatever has to do with manual labour, commercial occupations, and the rendering of tangible service to the society. In order to have intellectual and economic support by the society, every individual whether male or female is expected to do something. It is pity to find, more particularly in India, that service is much landed ideal of an individual and labour is sadly extorted. Strange it is that for those who can pursue lives of idle display, there is both appreciation and jealousy. In democratic communities such a life is badly condemned as it undermines better moral sentiments and there is a general tendency to recognize social responsibility for the use of time; and personal ability is much more valued than it used to be. Thus a happy life in democratic age and society is not possible without manual labour which consequently enhances the value of vocational training.

(2) Secondly, the industrial revolution of the last two hundred years has greatly enhanced the educational importance of vocation. If we closely study the present conditions, we will find that industrial revolution has totally changed the nature of business and occupations. Formerly every kind of work was manual, and very simple instruments were used which were handled and utilised by men themselves. The experts used to train and instruct their pupils in their art. On the contrary, in the present days almost all work is done by machines. In big factories, we see, that labourers work like machines. Manufacture and commerce are no more restricted to locality and are not merely incidental but world-wide. As a consequence of this change, the manufacturers and the captain of industry have substituted a landed gentry as the immediate directors of social matters. At present the problem of social readjustment is obviously industrial and closely connected to capital and labour. This tremendous increase in the social importance of industrial process has brought the schooling and industrial life very close. This indirectly means that social readjustment is practically impossible unless there is a change in the social conditions and this obviously necessitates a greater emphasis to the vocational education.

(3) Thirdly, our present industry has ceased to be essentially an empirical, rule of thumb procedure, handed down by traditions and customs. Its technique, on the other hand, is now technological, that is based upon machinery which is the outcome of the recent discoveries in mathematics, physics, chemistry etc. Besides the economic revolution has stimulated science by setting problems for solution, by creating greater intellectual respect for mechanical instruments. As a result of this, industrial occupations have far more greater intellectual possibilities than they previously had. This naturally lays stress and positively demands such an education which might enable the worker to understand the scientific nature of their pursuits else the worker will sink to the role of appendages to the machine they operate. In olden days personal knowledge and ingenuity were developed in a narrow range because the work was done with the tools under the direct command of a worker. To be successful in his occupation, a labourer is bound to adjust himself to the machine. Thus the burden of realizing the intellectual possibilities latent in the work is now thrown on the shoulder of the schools. If we compare the conditions of an ordinary worker in a factory with that in a laboratory, we will find the former too much under economic pressure to have an opportunity of acquiring knowledge. In schools there is every possibility of the association with the machines and the industrial processes under conditions where the chief concern of the stu-

dent is insight. The separation of laboratory and the workshop where such conditions are fulfilled is merely conventional.

(4) Besides the above mentioned causes, one of the main cause to give vocational bias to our present education is that the advances which have been made in psychology of learning in general and of childhood in particular fall in line with the increased importance of industry in life. The recent psychological researches have revealed the fact that the learning is not the work of mind but contrary to this mind is itself an organization of original capacities into activities. It thus leads us to realize the radical importance of primitive unlearned instincts of exploration, experimentation and try on. In developing the new native instincts of the grown-up pupils work plays the same part as play in does children. Besides it is but natural that the passage from play to work ought to be gradual. It must not necessarily involve a change of attitude but carry into work the element of play. This is only possible if ample scope be given to the vocational element in our school.

Last but not the least importance of vocational education is the training it provides for leisure. Leisure can only be enjoyed if work is done honestly and laboriously. The vocational education provides a greater opportunity for this than our present education.

From the above few arguments it can safely be inferred that the emphasis laid on vocational education is not merely based on economic necessity but it has its own justification from economic, social, moral and intellectual point of view.

THE SCHOOL BELL.

By SH. YAKUB ALI SIDDIQI C. X, JOINT EDITOR, ENGLISH.

O, Piece of iron, who are you? Why are you hanging here from a tree? Why are you so kind to inform us of the School-time? Tell me why you are so sorry.

Oh! please don't ask me about these things. Although I am a piece of iron yet people call me a bell. The people brought me from a market and they hung me here in a branch of a tree,

When I came here I thought that they would be kind enough to me but oh! See how unjust and cruel they are to me. Daily when you come to school they beat me with an iron rod and this they do nine times during the day.

When they behave me so badly I call on others to help me. How cruel you are that you take my roar for a song! After all I inform you to come to school and to go, but still when you are late and I am gone you unjustly call me bad names and you say "Today the bell has gone earlier". When you are reading and it is the Arithmatic period, you surely call me bad names and when the period is over you do not thank me and the reason why you do not thank me is that you are unthankful to God who created you.

After the interval, when you see the 'Chaprasi' going to ring me you want to stop him by talking foolish things to him, and when the bell is gone you come to your classrooms slowly and when you are late and marked absent all the fault comes to me. See how cruel you are and how I serve you !

Now you are weeping to see my heart so badly, bust I stop my talk.

"A GLANCE AT IQBAL."

By Dr. SYED MOHAMMAD AHMED "SHOHRAT."

"Dust thou art and to dust thou returnest"—*Bible.*

The death of Iqbal has launched us on deep seas of bereavement. Our eyes are covered with films of moisture when we visualise the ultra-genius personality, which has been snatched away from us by the cruel hand of Death. Born and brought up in the land of five rivers, he ennobled India by bringing great name and fame to her from distant corners of the world. He was a poet-genius, poet-philosopher and poet-reformer, of whom the futurity shall feel proud, and the coming generation shall esteem him as one of the greatest scholars that East has ever produced. His inborn faculties found the professorship of Arabic in London University too meagre to satisfy the glorious mission for which he came. His thesis on the 'Development of Metaphysics in Persia' not only gave him Ph.D. in Germany, but opened the eyes of the sharpest of the critics of the western world. He proved on the threshold of Cambridge that a slave country could produce such brilliant brains which could never be tarnished by the cold breaths of time. As a legal practitioner in India, the atmosphere was too choking for his divine out-bursts. His keen eyes saw the inner heart of India, felt the pulse of time, and directed all his energies in such channels which would elevate the sociological status of India. He had the vision of 'free motherland' in his mind, yet he was an international poet and his thin voice was soon amplified in far-off lands and his melodies reverberated in the ears of Shakespearean and Miltonic disciples of the West. From the land of the rising sun he sent constant messages in rhythmic undulations across the deep blues.

He was aware of the changes in environment around and was perfectly conscious of the doings of Nature in shaping and destroying the destinies of Nations. He had an insight into the psychological tendencies of human beings and he knew how they could be roused from their deep slumber and prevented from mental deterioration. He had studied the philosophical, cultural and historical aspects of nations from various angles of vision and his great works 'Asrar-e-khoodi' and 'Ramooz-e-bekhoodi' are miraculous achievements of human-mind.

As a Persian poet we find him standing aloft as a conspicuous contributor to the Persian literature. There, too, he is in no way inferior to Homer or Khaqani. He has been conscious not to lose his individuality by imitating the old Persian poets. He is ever new, ever fresh,—ever fascinating. With the sweetest language at his command and with wide range of expressions Iqbal scales the heights of human fancies, talks to the moon and stars, walks in space and time, and feels the unknown constantly impinging on his soul.

Urdu shall ever remain indebted to the glorious contributions of Iqbal. His hands combed the scattered locks of Urdu and definitely added jewels to its treasure. Grand style of writing, unparalleled by any of his contemporaries, lucid expressions, with tinges of pathos here and there, and apt use of metaphorical language make him the greatest poet of the East. Originality and creative faculties are seen in every line of his utterances. He has written a few 'ghazals' and a few 'epic odes' but he has not been immortalised by them. It is the way in which he left the long-trodden path of old epic poetry and plunged

himself into the long stretches of unexplored and unknown lands of realistic poetry. Mysticism was made to work in perfect unison with practical aspects of modern life. 'Bange-Dara' in 1924, was something of an eye-opener. It showed to the lovers of Urdu that mere chants of nightingale, elegies on the martyrdom of Islamic patriots and weeping in grave yards or wailing on the night of separation from sweetheart were no more required to fill up the chasms in Urdu poetry.

'Shikwa' and 'Jawab-e-Shikwa' were the heart-thrilling pieces of poetic excellence, where force of language, exquisite style and beautiful expression were all blended up to maximum. His poem "Ek Arzoo" is considered to depict the real emotions and feelings of one who is fed up with the hum-drum of life. The poems which he wrote for children are very inspiring and fill the hearts with a spirit of so-aring patriotism. They are simple but in no way lack in poetic diction. They add to the enthusiasm of the readers and enhance the strength of their moral fibre. 'Bal-e-Jibrael' and 'Zarb-e-Kalim' are his latest productions which show his lofty ideas and artistic skill.

Punjab loved Iqbal and his name was taken with much reverence. A crowded gathering was expected where Iqbal was to recite something and it has been known from reliable sources that subscriptions to the value of several thousands of rupees could be collected in no time, provided Iqbal would grace the occasion with a few of his couplets. There was discrepancy in U. P. where lovers of old creed of literature were not prepared to welcome his revolutionised form of poetry. They even hesitated to call him a poet. His thoughts were something quite above their heads and they knew only how to amuse themselves with old-fashioned poetry in old-fashioned 'mushairas,' little caring to find the demands of the public and little noticing the obvious deficiencies in the poetry itself.

Yet, Iqbal was above all these sham controversies. He stood unbiased and serene, and perhaps he was the only Urdu poet who became famous in his life-time, not only in lengths and breadths of India, but all over the globe.

Our hearts shall ever enshrine his memory and his poetry shall ever remain immortal, through whatever age it may pass.

"IDEAL OF A HAPPY LIFE"

By SHRAFAT ALI SYED, CLASS X.

To have an ideal of life before us is the first and the most important thing. Every one in this world has conciously or unconsciously an ideal of life before him. A man who lives up to his ideal is a happy man. But the standards of being happy may be different. For instance, a man lives happily, and there is no strife in his family. He gets sufficient money for his expenses; so he may be a happy man. But it is not and it cannot be a standard. The ideal of true and higher happiness is quite different from that false and of a lower happiness.

Happiness is of two kinds: Absolute happiness and relative happiness. Absolute happiness gives everlasting contentment and peace. Relative happiness gives only transitory or periodical satisfaction. Now a question arises. How can we get absolute happiness and what should be our ideal of life?

To answer the first question, I think that absolute happiness lies more within than

without us. We ourselves are responsible for that happiness. It is, therefore, our duty to acheive our goals, so that we may have a happy life.

About the second question, what should be our ideal of life? Myself am not certain. Everyone, in this world has his own ideal. But, in general, everyman wants health, wealth and prosperity.

As a student my ideal of a happy life is, to form a strong character, and not to cram books. Strong character is a thing which helps us in our life. It gives us confidence self-respect and contentment, and it is said, "Contentment is the mother of happiness" Tennyson has sung: "Self reverence, self-knowledge, self-control.

These lead life to sovereign power. And this soveriegn power we can get from a strong character.

My motto is 'plain living and high thinking.' I always pitch my ideals high. There is no need to be a wealthy man, there is no question of rolling in prosperity and affluence but to be sincere, true, prudent and hard-working. Wealth, in fact, does not necessarily contribute to our happiness. Some wealthy people lead a very miserable life. But good health is better than wealth. Sports, games, hobbies, recreations are different things beside health, by which we can enrich our life.

Evidently, you think that wealthy people are without doubt happy, but it is not true. Apparently, they are happy but in reality they are sad at heart. They cannot sleep soundly Their sleep is disturbed by hideous dreams and it becomes very difficult for them to live. Here a man———a wealthy man,—feels helpless. He finds that his wealth is of no use! He passes a dull and monotonous life——a life surrounded by the pitch dark clouds.

A selfish and norrow-minded person also cannot live happily. So we must have a sense of appreciation, which is the most important secret of happiness. Without any distinction, without prejudice, and without jealousy we must appreciate all those things which are good. "Justice and appreciation make a man perfect," as has been said by someone. We should not hanker after wealth or try to deceive other or other such things that pick ones conscience.

"There is true church" Ruskin says, "where our hand meets another helpfully." "To serve humanity is to serve God." Under all circumstances it is our duty to serve human-beings. Above all, the most important factor of happiness is to serve the needy and the helpless people.

The fellow feeling of Muslims from Morocco to China, whatever their race or colour, their language or nationality is a great object-lesson to man-kind in the possibility of a universal brotherhood based on spiritual ideals. J. S. HOYLAND.

* * * *

Of all forms of prestige moral prestige is the most valuable. UNKNOWN.

The Union of theoriser, organiser and leader in one man is the rarest phenomenon on earth; therein lies greatness. HITLER.

* * * *

The art of leadership is a serious matter. He who wishes to lead a movement must conduct a fight on two fronts, against those who lag behind and those who rush a-head. STALIN.

"WONDERS OF SCIENCE."

(Achievements of Marquis. G. Marconi—the Wireless Telegraphy and the Radio.)

By I. B. GUPTA, B. Sc., A. T. C.

My young readers, all of you know that there are seven Geographical wonders of the world, but perhaps only a few of you know the "Seven Wonders of the Modern World"

A few years ago the votes of the readers of an American periodical—Popular Mechanics—were taken as to what inventions were considered to be the "Seven Wonders of the Modern World". Those which received the highest number of votes were,—(1) the Wireless Telegraphy (2) the Telephone (3) the Aeroplane. (4) Radium (5) Anaesthetics and Antitoxins (6) Spectrum analysis and (7) X-rays. Can you deny that each of the above inventions is one of the most wonderful things in the world today?

My juvenile friends, you should know that a great man, whatever may be his country or nationality, does not belong to any particular section of humanity. He belongs to all mankind. Greatness can neither be limited by space or time nor by colour or creed. As the work of a greatman benefits the whole of humanity no nation or country has the right to call him exclusively its own. Take for instance the works of Sir Muhammad Iqbal, the immortal poet of the Punjab. He belongs to the whole of humanity. His ideas and teachings are the property of the whole world and not of one section of people. Such also are the achievements of great scientists. Their discoveries and inventions—the fruits of their untiring labour and infinite patience—are not the property of any particular country—or nation. In other words they belong to the whole of mankind.

In my previous article I gave a brief sketch of the life of the great scientist, Michael Faraday who is known as the Father of Electricity on account of his great discovery of the principles of the Magneto-Electric Induction. In the present article I shall briefly deal with the life and work of another scientist whose greatest invention—the wireless telegraphy and consequently the modern radio broad casting—has made him immortal.

My little citizens, are you not enjoying the benefits of modern civilization? Have you not a radio set at your home? If not, perhaps one of your neighbours has one. Today you sit in your own room and enjoy a radio programme consisting of songs, talks, speeches, reports and dramas broadcast from a distant radio station. You can connect yourself with the most distant place of the world and listen to a person speaking on any subject. Is it not wonderful to have all these facilities within one's easy reach? One may say it is more than wonderful, it is great. But do you know who has the credit of the invention of this most interesting and wonderful thing? It is Marquis G, Marconi, an Italian, who has given you this wonderful thing and has brought a new era on earth by inventing the wireless telegraphy. What a tremendous change has been made today by his invention can easily be realised. Communications between the most distant parts of the world have now become easy and quick. Rescue of ships in distress by transmission of wireless messages

has become most common now-a-days. Crowning all, Television, the transmission of photographic visions by the wireless system, is now almost within the bounds of possibility. All these we owe to Marconi.

Marquis G. Marconi was born in the city of Bologne in Italy in the year 1874. His father was an Italian while his mother was of Irish descent. Soon after Hertz had given the world his wonderful researches about Electro-Magnetic waves, the scientific world realised their importance. From an early age Marconi was deeply attracted towards these works of Hertz. In 1895-96 he made attempts to put these experiments to practical use. He wanted to adapt them to a system of wireless telegraphy through the ether. As a result of his attempts he was able to establish wireless communications over a distance of two miles. In 1898 he sent messages from Poole to Alum Bay, a distance of 18 miles and in 1910 he was able to produce electric waves so powerful that their influence could be detected and signals read at a distance of six thousand miles. Marconi himself has written, "The khowledge of how to produce and how to detect, these ether waves, the existence of which had been so far unknown, made pessible wireless telegraphy".

In the words of a famous author "Wireless telegraphy has now become part of our every day life. The waves conceived in a physical laboratory are now continually carrying messages across the sea and land. The invisible and immaterial ether is set vibrating and these tremors (vibrations) awaken sympathetic response in instruments on war ships hundreds of miles away. Ships in distress can send their call for help into the darkness. Their call goes out in ever-widening circles, like the waves produced on the calm surface of water when a stone is thrown into it, so that any vessel with wireless telegpraphy apparatus, which comes within their sphere of influence will respond to it and hasten to the rescue.

The first notable instance of the use of the wireless message in saving life at sea occurred in January 1909 when a ship called Republic collided with another ship Immediately the wireless operator sounded the signal of distress "Am in distress and need assistance.' The news was received by some wireless stations and sent to another ship named the Baltic that came within reach with great difficulty and succeeded in rescuing the passengers and crew of the sinking ship.

But the most dramatic use of wireless telegraphy at sea occurred in April 1912, when the Titanic, the largest vessel in the world, struck an ice burg on her maiden voyage from Southampton to New York. She was fitted with Marconi instruments. Several vessels heard the wireless appeal for help but when they reached the foundered ship only nine hundred souls out of more than three thousand human beings could be saved."

All this we owe to the knowledge, confidence and daring of Marconi who invented the wireless telegraphy.

In 1897 Marconi took a patent for his wireless instrument in England. The same year he established a wireless station at Spagia for the Italian Government and the Marconi wireless telegraphic company was established in England. Messages were also sent over the English Channel the same year. The Marconi instrument was used in the South African war.

In the mean time Marconi made considerable improvement in his instrument. As a

result of this it was possible to establish wireless communications between Cornwall and New Foundland in 1901. In 1903 arrangements were made for transmitting wireless messages between England and America. In 1910, as has already been mentioned, Marconi invented a new and more improved receiver and detector and next year these were fitted in big sea-going vessels.

During the great war Marconi was the officer-in-charge of the Wireless Department of the Italian Government. In 1916 he established a "short wave" station in England. In 1924 he invented the "Beam System." After this he performed experiments chiefly about transmission of short wave messages and of installing radio signalling apparatus in ships and aeroplanes.

Marconi received honours from many institutions. In 1909 he got the Nobel Prize in Physics and in 1914 he received the title of G. C. V. In 1915 he became Senator of the kingdom of Italy and in 1929 he received the title of Marquis.

Only recently Marconi breathed his last at the age of 63 when he was at the height of his glory.

Marconi has devoted his whole life for the advancement of human comfort and happiness. His work is not confined to one country only. The whole world has adopted his system of sending messages both by wireless telegraphy and radio broad-casting. The sole aim of his life was to improve the wireless telgeraphy and the radio. He had no conceit in him. Once a lady had remarkd, "Communication by wireless telegraphy is very wonderful". To this the notable reply of the inventor was, "It is not half so wonderful as our conversing together", meaning thereby that no scientific invention could approach the perfection reached by Nature.

Marroni's inventions have made it possible to rescue the lives of thousands of people, and today broadcasting from the Radio station is enabling people to enjoy the pleasure and benefit of interesting and instructive talks, speeches, reports, songs and other entertainments at the cost of a small sum of money.

Does not this command our admiration for this great inventor? After this who can say what will be done by science in the future?

"WARS."

By HASAN KAMAL, CLASS X A.

'Twenty men drowned and property worth thousand of rupees lost in the recent floods," we read. "Twenty men drowned"—really great number. Twenty widows and twenty helpless families—we are shocked. But little attention does one pay to the enormous number of men slaughtered and an equally enormous amount of money wasted in a single war—'Half a million dead, half a million widows and half a million son-less mothers, half a million orphans doomed to suffer; a million wounded, a million disabled and made useless for life.'

In the war of the French revolution and those fought by Napoleon, it is estimated that Frnce lost more than 2 million of her sons and an equal number were wounded and disabled. In the nine principal battles fought under the leadership of Napolean, from the Austerlitz to

the Waterloo, about 19,00,000 men were employed. Of these 386,000 men were killed and wounded. In money Napoleon spent about £ 255,000,000.

In the Crimean war the total losses of all the three countries, Russia, England and France were 480,000 men. England left 22 per cent of her men engaged, dead on the battle fields of Russia. But when compared with other wars the Crimean war is comparatively a small affair as far as losses of men are concerned. It took £ 313,000,000 to conduct the Crimean war; of which Great Britain paid £ 78,000,000, Russia £ 142,000,000 and France 93,000,000. On an average the daily costs were—Russia £ 2,000,000 France £ 130,000 and England £ 100,000.

In the American Civil War about 600,000 men were laid to rest in a short period of four years. The expenditure for the whole war came up to about £ 121,000,000. Each week about £ 1,600,000 was spent. The Franco-German war in its short period of only seven months took a toll of 371,700 men (both killed and wounded). About seventy-one thousand Frenchmen and a million Germans had taken part. France was forced to pay a war indemnity of £ 316,000,000.

In the Russo-Turkish war which took place in the year 1877 and lasted for a year the total losses for both parties were nearly 200,000 men. During a single day in the battle fought before Plevna 18,000 out of 80,000 Russians fell. Turkey also suffered heavy casualties. The battles fought between Japan and Russia in the Russo-Japanese war, were the deadliest, involving the killing of many thousands in a single day. At Tiam-Yong, where one of the battles was fought, Russia lost 20,000 and Japan 18,000 men—all in a very short period. In the battle of Sha-Ho Japanese losses were about 16,000 men. Russia lost 60,000. Equally deadly was the battle of Mukden where one million soldiers were engaged. Coming to the costs, Russia spent about £ 1,091,200 per week to carry on the war.

Deadlier than Russo-Japanese war was the Great War. Here battles took many days to be decided and the number of killed and wounded amounted to fabulous figures. In the first three months of the war 1616,000 men fell. Of them the French numbered 854,000 men; the Germans 677000, men; the British 85,000. The total loss for the world due to the Great War is about 4647,000 men killed and nearly 8,297000 wounded. The heaviest of losses were suffered by Germany—2,050,400 killed and 4,202,000 wounded; while the British Empire suffered 1,089,900 as killed and 2,400,900 as wounded. France lost 1,393,300 men killed; 1,490,000 of her soldiers were disabled.

In money alone, Germany, excluding her war indemnity, spent about £ 5000,000 per day. France's cost was about £ 4,409,000 per day. Great Britain had the greatest war expenditure. In 1917, the average cost of war to her was a little more than £ 49,000,000 per week. The total at the end of 1918 amounted to more than £ 500,000,000.

In spite of multiplicity of inventions and comforts we are no happier than our ancestors, probably less happy than they were. Happiness depends to a large extent upon our outlook on life. UNKNOWN.

* * * *

Not believing in force is the same as not believing in gravitation. TROTSKY.

* * * *

There may be human joy in doing good with definite purpose, but they who do good expecting nothing in return know a joy that is divine. MAETERLINCK.

THE NATURE OF THE STATE

By R. K. ISALM, M.A., B. T.

Before attempting to define the form 'State', it would be better if we traced the history of the idea embodied in the term and also discussed and explained a certain number of verbal ambiguities which have arisen around the term from the inexactness of everyday language.

People in ancient days had no idea of the state. To the Greeks and the Romans, the modern idea of the state was not clear. They i. e., the Greeks, even did not use the term. They spoke of it as *polis* (city). They lived in small city-states like Sparta, Athens, Thebes, Corinth and so on. They had no country-or nation-states. Small cities with some villages around them were known as states. Then in the Middle Ages people used the term the **"universal state"**. At present we use the phrase the **'nation state'** or the **'country state'**, that is, the modern state. The latter idea had its origin in Italy. By the 16th. and the 17th. centuries the term came to be adopted in English, German and French literatures. Since then the term has undergone various changes in its meaning and connotation. It has often been used interchangeably with terms such as Government, Society, Nation, Nationality, etc. In an essay on the nature of the state we must explain each of these terms so that the term state may be easily distinguished from these pseudosynonyms of it

The State and Society:—These two terms are different Society is sometimes broader and sometimes narrower than the state. Generally when we speak of society it includes the family the church, the state, the cultural organisation etc. So we can say that the state exists within society. Still the state is not a form of society. What distinguishes the state from society is that the state is a system of order and control. The state uses physical force, but society in all civilized countries can only use persuasion or public opinion. The state is the only institution which can legitimately use force. In history there have been peoples who had a society but no state, for example, the Esquimaux. In simple words the state is society organised politically.

The State and Government:—Government is simply an instrument of the state. Rousseau has described Government as the **"living tool of the state."** The state is largely an abstract conception; Government is something concrete. The state is permanent; while government is transitory. The power of Government is not original. It is delegated. It is given to it by the state. So we say Government is the instument of the state. Garner says, **"It is the agency through which the will of the state is formulated, expressed and realized."**

The State and Nation:—We use two terms interchangeably. They are nation and nationality. But it is a mistake. The term nation has come to assume a definite political meaning. It means the state together with nationality. This combination is summed up in the phrase Nation-State. When we speak of a nation-state we mean the people who have the national spirit and are organised politically in the state.

Nationality means a spiritual sentiment or principle which links people together. A nation may be composed of more than one nationality, *e. g.*, the British nation which is composed of the English and the Scotch nationalities.

State and People:—The state is a legal or more correctly a political concept, while the people is to a large extent a racial or ethnical concept. A people comes into being by a slow psychological process and gradually develops a type of life and society which differentiates them from others, and constitutes the fixed inheritance of their race. A mere arbitrary combination of men, or even the voluntary agreement and contract of a number of persons or between sects cannot create a people. To from a people, the experiences and fortunes of several generations must co-operate, and its permanence is never secured until a succession of families handing down its accumulated culture from generation to generation has made its characteristics hereditary.

Now having seen what the state is not, let us see what it is. We shall now define the state. The term has been variously defined. We will endeavour to state here only some of the definitions as given by prominent political philosophers and writers. Bluntschli defines it thus: **"The state is the politically organised people of a difinite territory."**

Burgess—**"The state is a particular por. tion of mankind viewd as an organised unit."**

Woodrow Wilon **"A state is a people organised for law within a definite territory."**

Now the most clear and analytical defintion of the state is that given by Garner. He says, **"The state, as a concept of political science and constitutional law, is a community of persons more or less numerous, permanently occupying a definite portion of territory, independent of external control and possessing an organised government to which the great body of inhabitants render habitual obedience."** He then goes on to analyse the definition thus:—

(1) a group of persons acting together for common purposes; (2) the occupation of a definite portion of the earth's surface which constitutes the home of the population; (3) independence of foreign control; (4) and a common supreme authority or agency through which the collective will is expressed and enforced.

Thus we see that the state is both an abstract conception and a concrete organisation. As an abstraction, it is merely a juridical person, a corporation, separate and distinct from the physical state. As a concrete organisation it includes the people, territory and government.

Let us now see the essentials of a state. A state worthy of the name must have the following four things:—

(*i*) *Population*:—There can exist no state without a population. It is composed of citizens, *i. e.*, those who are active participators in the common will; subjects that is, those who are passive members having no share in the public power, and aliens, that is, foreigners staying within the state temporarily. But it must be noted that modern democratic states are composed of only two elements of population—citizens and the aliens. There is no such division as the active and passive participators in the state. It applies to the slaves and citizens of a Greek city state.

(*ii*) *Territory*:—A permament relation of the people to the soil is necessary for the continuance of the state, nomadic or wandering people, *e. g.*, the Jews before they settled in Palestine and the wandering German tribes after the break up of the Roman Empire, can never be said to have established a state. Sovereignty is no longer considered personal but territorial. The area of a state not only determines **"its capacity for self-defence, its**

power and influence in the family of nations, but to some extent the form of its governmental organisation and its activities."

Sovereignty:—It means external and internal independence of the state. It popularly means the original, supreme, and unlimited power of the state to impose its will upon all person, associations and things within its jurisdiction. Viewed **"internally,"** this means that a state has complete authority over all individuals and associations of individuals that compose it; viewed **"externally"** it means that a state is completely independent of the control of any other state.

(iv) *Law and Order:*—This is also known as **"organisation."** Some organisation must exist through which the collective will may be ascertained and expressed and the ends of the state realized. Either as a result of mutual agreement or as a result of compulsion, some form of political machinery or government, which either receives or compels obedience, must be created to from a state. If there is none who possesses authority, and none who obeys, remarks Bluntschli, there is no state but only a condition of anarchy.

Now we will throw some light on some aspects of the state from the positive point of view, using the term positive in the sense of correct.

(1) The state is both natural and necessary. It is not an artifical creation. We are born into the state. We do not choose it.

(2) The state is a universl association. Wherever human beings have lived in groups there have been organisation and authority, and wherever we find those two things, we find the nucleus of the state.

(3) The state is not in a class with the Church, Family, Trade Union, etc. It is in a class by itself. The state is an all-inclusive association. It is an association *par excellence.* It is a group of groups or a society of societies.

(4) One chief function of the state is the adjustment of differences.

(5) Sovereignty and law are the two chief characteristics of the state.

(6) The state enforces a system of impartial law.

(7) The state is a permanent and fixed institution, only governments change.

(8) The state concerns itself with the universal interests of mankind and not with his sectional interests.

(9) The state can regulate only the outer aspects of human conduct, in other words, it concerns itself only with man's external conduct and not with his motives. It may take intentions into account, but not motives.

(10) The state cannot promote morality directly. It can only make possible for the individual to promote his own morality. It cannot enforce religion and morality.

(11) The state is the only body which can use force. But force is not the basis of the state. "Will, not force," says Green, "is the basis of the state."

We have seen the positive views of the state. Let us now, at the end of the essay, see some of the negative or one sided views of the state, for the latter are as important as the former for grasping the true meaning of the state. They will remove any doubts that one may have regarding the exact significance of the state.

(1) Oppenheimer, in his book, the State, says the state is an organisation of one class

dominating over the other classes. It is a narrow definition. When we think of the state we think of it in the abstract. But this definition defines the state in the concrete. This definition finds its parallel in the Marxian theory. Marx divided the people into two groups—the rich and the poor. He said a time would come when the poor, getting poorer, (and the rich richer) would dominate the rich because the poor would form the majority.

(2) Another school says the state is force. Machiavelli and Grotius are its chief exponents. This definition is wrong. No doubt force is an essential of the state, but is not the basis of it. Green has rightly remarked that, "Will, not force, is the basis of the state." No doubt without force there can be no state, but force is not all. Might does not and cannot make right. It is the right which lends support to might.

(3) Then some would say the state is a welfare system. It is true that it promotes welfare, but it is not the only end. Besides, this definition, if definition it can be called at all, does not give us the true definition of the state. It aims at the goal of the state. Althusius, a writer of the Middle Ages, held this view of the state. According to him the state is a Public Utilities Company. In recent times the Utilitarians of England held the same view.

(4) Legalists would say that the state is a community "organised for action under legal rules." This too is a narrow definition. It takes only the legal aspect of the state into account and not the philosophic aspect.

(5) There are writers like Spencer who have looked upon the state as a Joint Stock Protection Company membership in which is voluntary. It is not only narrow, but false. The state is not emphatically in the nature of a company. The membership is not voluntary. We are born in it. The state, as Aristotle said, is the natural and necessary institution. It is not an artificial creation.

(6) To some people like Bentham (the founder of Utilitarianism in England) the state is a necessary evil. In other words the state is a concession to human weakness. Had man been perfect there would have been no state. It is a mistaken point of view.

(7) Some say that the state is an evil that will some day become unnecessary. This view is held by mild anarchists. They believe in the possibility of human perfection. Tolstoy also held the same view.

(8) Extreme anarchist holds that the state is an unmitigated evil. It is evil pure and simple. In simple words the anarchist knows nothing except throwing bombs.

Now we finish the essay by giving in a summary way the idealistic point of view. By idealistic we do not mean that it has no relation to facts. It means that it has relation to ideal facts. According to this point of view the state is the best friend of man. It is not simply a disinterested observer. This viewpoint has its origin in Greek political thought and in the thought of Rousseau.

The state, as the Idealists would say, is necessary for man's inner growth and development. Without the state man cannot reach the height of perfection. The individual and the state do not belong to two different categories. As a matter of fact both belong to one common unit—the end of both is same, viz. "the fullest and freest development of human personality."

GRAINS OF KNOWLEDGE

By YAKUB ALI, JOINT EDITOR.

1. The Nobel Prize was founded by Dr. Alfred Nobel, a great scientist and inventor of dynamite, in 1895. For this purpose, he deposited a large sum of money, the interest of which is distributed annually in the form of five prizes. These are awarded to persons who have performed the greatest service for humanity. Persons who have made the most important inventions or improvements in Physics, Chemistry, Physiology or Medicine, and Literature are the recipients of this unique honour. The fifth prize goes to the person who has been most successful in bringing about peace and reconciliation amongst the nations of the world.

The prizes are international and are open to the individuals of every nation in the world. The value of each prize is Rs. 110,000. So far 151 prizes have been awarded. Germany tops the list of the prize winners, with forty prizes to her credit. The remaining prizes were distributed throughout the rest of the civilized world. India has been awarded only two prizes—one for literature and the other for physics. They are held by Sir Rabindra Nath Tagore and Dr. C. V. Raman respectively.

2. The Turkish Republic is the most powerful independent muslim state in the world.

3. The total population of the world is 200 Crores. India, therefore, contanis about one fifth of the human race.

4. Germany is spending 1300 crores of rupees annually on her rearmament programme.

5. United states of America are the richest country in the world. The average per head income in that contry is Rs. 4 daily. The average per head income in India is 1 anna per day only. What a glaring contrast!

6. German forests are the most scientifically kept in the world.

7. The difference between the highest and lowest point on the surface of the earth is almost twelve miles. If the highlands of the earth were planed down, and if the material were spread over lowlands, so that all parts above the sea had the same height the land would be a little less than half a mile above the sea. If the sea bottom were made smooth, the depth of water every where would be about two and a half miles.

8. G. Washington was the first president of U. S. A. Washington, the Capital of U. S. A. was named after him.

9. Australia is the leading exporter of wool in the world.

10. The gold output of south Africa is largest in the world.

11. Scott was one of the discoverers of the South Pole.

12. Russia is the largest compact state in the world.

One of the most improtant parts of education, and one of the most neglected, is that which teaches how to reach true conclusions on insufficient data. B. RUSSELL.

Men who are not willing to listen to argument easily convince themselves that their own principles are exclusively the truth. H. SPENCER.

CUPID'S VICTIM

By FAREED AHMAD SIDDIQUI, (Ex STUDENT)

It was getting dark. The storm was rising higher and higher; the terrific downpour of rain, the crash of thunder and the repeated blinding flashes of lightning were stunning my senses. Black clouds were running hither and thither, as if, to hide themselves from this dreadful sight.

The river was lashing into fury and the trees of the valley were swaying from side to side, sighing and groaning. Some one knocked at my door.

Many a wild thought passed through my mind, and I pitied that wanderer of the night, thinking that he was a stranger and wanted to take shelter at my place. I got up at once and opened the door.

A boy of young age who had a graceful and lovely face, long and black curly hair, big, blue and lustrous eyes, entered the room.

He had a small but strong bow in his hand and an inexhaustible quiver on his back.

He was shivering with cold. I gave him clothes to change and a cupful of milk with honey to warm him. I seated him near the fire place of my room, where he remained for the whole night.

When we woke up, it was a pleasant summer morning. The breezes were blowing gently, putting the flowers which were nodding their heads and kissing each other.

I took my guest to the garden, hand in hand, and sat by the laping waves of a lake. The birds were enjoying their morning bath and the rustling of leaves was producing a vague music.

I asked his name; but he smiled, took an arrow from his quiver, fixed it to his bow and loosened it on me in reply. It made its way into my heart. Then he vanished with the words "Go in search of another heart pricked by my arrow. That alone can give you peace and tell you my name."

Oh! then I knew who he was and what was his name. I recollected his last words and began to wander about in search of the promised personality, the missing counter part of my existance. I wandered for many years without finding the object of my wanderings.

I do not know how long will I have to continue the search, and whether I will at all gain my object on this side of my grave.

Leisure is pleasant only if a man is already assured of the reason for existance.
W. H. DURANT.

Democracy which can not defend itself has no right to exist. EMILE FRANKE.

It is difficult to play many roles to perfection at the same time. VISCOUNT BRYCE.

All children are born good. UNKNOWN.

The wise man in his attitude towards the world has no prejudices. He is on the side of what is right. CONFUCIUS.

The entire object of true education is to make people not merely do right things, but to love knowlege and purity. RUSKIN.

IQBAL & NATIONALISM

By SYED ILTIFAT HUSAIN, B. A. (LUCK.)

It is truly said that God created human beings and Satan divided them into nations. The concepts of Utility and Rationality, the two dominant notes of western civilization, are the chief cause of the degradation of the highest virtue of Patriotism to a mere passion of land-grabbing. Thus national jealousies, national hatred, and national hostilities always end in bloodshed and Nationalism, which is to a great extent responsible for the domination and exploitation of the weak, is a curse to humanity. Iqbal says:

اقوام جہاں میں ہے رقابت تو اسی سے
تسخیر ہے مقصود تجارت تو اسی سے
خالی ہے صداقت سے سیاست تو اسی سے
کمزور کا گھر ہوتا ہے غارت تو اسی سے
اقوام میں مخلوق خدا بٹتی ہے اس سے
قومیت اسلام کی جڑ کٹتی ہے اس سے

Nationalism in West.

In the pre-war Europe, Country and Nationalism constituted the highest form of morality and the West, being intoxicated with power, adopted national aggrandizement as its guiding principle. The church was thrown away and the atheistic trend of Nationalism welcomes as its creed the motto: Country above Religion.

اس دور میں مے اور ہے جام اور ہے جم اور
ساقی نے بنا کی روش لطف و کرم اور
مسلم نے بھی تعمیر کیا اپنا حرم اور
تہذیب کے آذر نے ترشوائے صنم اور
ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اسکا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

The west was thus advancing and progressing by leaps and bounds in the realms of Materialism and never thought that this Godless-Civilization will drift the humanity towards an inevitable crash, bringing misery and devastation. The explosion of the Great War burst the bubble of Nationalism, which stood on the sandy foundations of selfishness. The Science with all its enlightenment, rationality, and civilization could not save the humanity from such a disastrous calamity. The modern man, who thought himself to be the monarch of all he surveyed, had to admit that he is not the maker of his destiny. The west had to condemn national aggrandizement for the attainment of the highest goal of civilization and had to widen its outlook beyond the national four walls. The demon of self seeking aggressive nationalism was no more wanted. Rationalistic philosophy could not satisfy the longings of the soul and the west began to realise that a Godless-Civilization can never bring World-peace. The good comes out of the evil and so the post-war Europe came out of the Great War more chaste and gentle than the pre-war arrogant selfish Europe. The west learnt the lesson of nourishing a love for humanity and developed sufficient sense of justice to have a regard for the rights of others. This new outlook of life laid the foundation of Internationalism and the slogan "My country, right or wrong" lost its ground.

مشرقی بادہ چشیداست زمینائے فرنگ
عجبے نیست اگر توبۂ دیرینہ شکست
فکر نوزادۂ اوشیوۂ تدبیر آموخت
جوش زد خون بہ رگ بندۂ تقدیر پرست
ساقیا تنگ دل از شورش مستان نہ شوی
خود تو انصاف بدہ این ہمہ ہنگامہ کہ است
بوئے گل خود بہ چمن راہ نماشد زنخست
ورنہ بلبل چہ خبرداشت کہ گلزارے ہست

Nationalism in East.

The East being subjugated and exploited by the West had to follow the footsteps of the western civilization. Though Eastern people are clinging fast to Faith and God, the western education and the westernized outlook is sufficiently tempting enough to attract them towards Materialism. Nationalism and material sciences became the watchword and the East entered the same cycle which has been just completed by the West. The spell of the West enchanted the very souls of the Eastern people and they began to ape the pre-war West. This trend of thought set in motion the wave of Nationalism throughout the East with an enormous zeal and the Eastern-Nationalism followed the same creed: Country above Religion.

The fact that Nationalism is saturated with the germs of atheism touched the feelings of Dr. Iqbal and he came out as a prophet to rescue the East from that sad plight in which the West plunged headlong and thereby suffered devastation and misery. It is for this noble service that Dr. Iqbal is severely criticised by Indian nationalist, who wanted that he should also cry the slogan: Indian first and a Muslim afterwards. But let me place before my nationalist friends some querries about Mahatma Gandhi, the central force of the national movement of India. Is he not devoutly religious? Is not Swaraj Ramraj to him? Has he placed country above religion and desired to get Swaraj at the cost of religion?

No, certainly not. He wanted Swaraj for religious freedom. He is above national jealousies and hated the oppressors of India, not Englishmen. His political enterprises were not of baser nature where vice can play a havoc. He wanted Swaraj so that his countrymen may lead a happy and virtuous life. National movement of India was not coloured by him as anti-religious. He always heard the call of Religion and Spritualism; but his reliogisity was dismissed by the younger generation as the 'idiosyncracies of Mahatmaji.' Their zeal for Westernization led them astray but Mahatmaji showed an utter disgust for the Western materialism. The ideal of Nationalism which he placed before India was free of atheism. He realised the fact that a movement can not last long unless it has some moral and spiritual force in it. Similar is the case with Dr. Iqbal, he says that a true Nationalism is that which is wedded to Religion. Power-nationalism of the West robs us of paradise and destroys the feeling of universal brotherhood. It makes us stranger to each other and is the cause of bloodshed, therefore, we should never allow country to attain superiority over religion. He compares country and religion by saying:

کرد مغرب آن سراپا مکرو فن
اهل دین را داد تعلیم وطن
او بفکر مرکز و تو در نفاق
بگذر از شام و فلسطین و عراق
تو اگر داری تمیز خوب و زشت
دل نه بندی باکلوخ و سنگ و خشت
چیست دین برخاستن از روئے خاک
تا ز خود آگاه گردد جان پاک
می نه گنجد آنکه گفت الله هو
در حدود این نظام چار سو

Patriotism is no doubt the highest virtue and, according to the teachings of Holy Quran, a nation has every right to free herself from foreign domination; but Dr. Iqbal never asks you to abdicate Patriotism, he only condemns that kind of Nationalism, which destrosy universal brotherhood and tries to enslave

other nations for the sake of world supremacy.

ابھی تک آدمی صید زبون شہر یاری ہے
قیامت ہے کہ انساں نوع انساں کا شکاری ہے
نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیب حاضر کی
یہ صناعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے
وہ حکمت ناز تھا جس پر خردمندان مغرب کو
ہوس کے پنجۂ خونیں میں تیغ کارزاری ہے

Let me quote some of his verses from Jawed-Nama. The true conception of nationality, he explains thus:

آن کف خاکے کہ نامیدی وطن
این کہ گوئی مصر و ایران و یمن
با وطن اہل وطن را نسبتے است
زانکہ از خاکش طلوع ملتے است
اندرین نسبت اگر داری نظر
نکتۂ بینی ز مو باریک تر
گرچہ از مشرق برآید آفتاب
با تجلی ہائے شوخ و بے حجاب
در تب و تاب است از سوز درون
تا ز قید شرق و غرب آید برون
بر دمد از مشرق خود جلوہ مست
تا ہمہ آفاق را آرد بدست
فطرتش از مشرق و مغرب بری است
گرچہ او از روئے نسبت خاوری است

Internalism:

The west tried to find the way out of Nationalism and followed the golden rule of Internationalism to bring the humanity to its goal of completion. The Kellog pact, the Washington agreement, the World's Disarmament Conference of Geneva proved to be the futile attempts for eradicating the evil of war. the Treaties in the League of Nations remained a binding so long as a nation could not feel itself strong enough to treat them as mere scraps of paper. In fact, the problem of world peace can not be solved unless we destroy the greed of nations to exploit the weak and to acquire world supremacy. To-day the League of Nations has proved to be a farce and we can not but admire the criticism of Dr. Iqbal, who satirized the League by saying:

برفتد تا روش رزم درین بزم کہن
دردمندان جہاں طرح نو انداختہ اند
من ازیں بیش ندانم کہ کفن دزدے چند
بہر تقسیم قبور انجمنے ساختہ اند

Islam and World Peace.

Internationalism is too weak to take up the cause of the uplift of mankind. **The evil of national aggrandisement can be remedied only by the Full Development of Man. Holding the fact that the full development of an individual pre-supposes a society, we have to launch a new campaign for finding out an Ideal Society to fulfil our aims.** Such a unique type of society is found by Dr. Iqbal in the **Holy Prophet's conception of Islam,** which literally means entering into a state of peace. Let us see how Islam, the ideal society as stated by Dr. Iqbal, can attain the goal of completion for humanity.

1. Unity of Race :

The unity of race, it appears, is the true basis of Internationalism and the League of Nations have failed to secure it through the the treaties, which at times have no more value than mere scraps of paper. Islam does not form a League or a Court of Arbitration

to unite races and strengthen their friendly relations but lays down the foundation of **the Unity of Human race on the Doctrine of the Unity of God.** These ideas are so closely related to one another that one ,appears to be incomplete without the other.

The very first line with which the Holy Quran opens is "All praise is due to God, the Rabb (Lord) of all the nations." The word Lord is not an actual synonym for the Arabic word Rabb, which means' the foster of a thing in such a manner as to make it attain one condition after another until it reaches its goal of completion.' Thus the arabic word رب العالمين (the Rabb of all the nations) clearly gives us the conception of God, who is the creator of all the nations, fosters all the creatures and brings them all to their goal of completion by degrees. Further we find: "O Men! we have created you all from a male (Adam) and a female (Eve) and made you tribes and families that you may know each other. Surely the noblest among you in the eye of God is the one, who is most mindful of his duty." It clearly indicates that all the people of the world are to be treated as the members of one human family, where no honour is given to the colour and the language of the people but to their noble deeds.

Apart from this, we find several other verses, which show that Islam does not favour Nationalism. It would not be out of place to mention some of these verses here :

> All people are a single nation. (2-210)
>
> People are naught but a single nation.
>
> Say, I seek refuge in the Lord of Men, the King of Men, the God of Men. (114: 1 to 3)

It is worth noting that the verse does not mean the Lord, the King and the God of Muslims only but the Lord, the King and the God of all men.

> Call upon me and I will answer you. (40: 6)
>
> And my mercy encompasses all things. (17: 156)
>
> Surely thy Lord is the Lord of forgiveness to people inspite of their wrongs (13: 6).

Here too we find that the word **people** is used and not the **name of any chosen nation.**

And we will set up a just balance on the day of resurrection, so no soul shall be dealt with unjustly in the least. (21: 47)

We can conclude from these verses that God hears the prayer of all, forgives the sinners and is just and merciful to all, showing no favouritism to any nation. Thus the conception of the Unity of God clearly shows that God is not simply the creator and the fosterer of all but his dealings are also equal and just with all : We see that the idea of the Unity of Race is so mingled with the doctrine of the Unity of God that it is very hard to draw a line of distinction between them without affecting any change in the idea......one is dependent upon the other.

2. No Favourite nation Theory.

Islam has thus laid stress on the unity of human race and condemns Favouritie nation theory. The Holy Book says; "Every nation had an apostle." (10: 47) "There is not a people but a warner has gone among them." (35-24) It shows that along with the faith in the Holy Prophet a muslim is directed to

respect other great religious personalities of the world. The names of several prophets, kings, philosophers, and reformers like Zulqarnain, Luqman, Moses, Christ, Hud and Saleh etc. (may peace be on him) are mentioned in the Holy Book and a muslim is instructed that : Say, we believe in God and in that which has been revealed to us and in that which was revealed to Abraham, Issac and Jacob and the tribes, and in that which was given to the prophets from their Lord, we do not make any distinction between them and to Him do we submit." (49-13) **Thus the narrow mentality of establishing the superiority of one nation above all other nations of the world has no place in the teachinri of of Islam and a muslim has to think that all the nations and men are equal in the eyes of God.** They have been equally dealt with by Him and He has sent His message to them through their prophets. To strengthen this basic principle and to put the racial prejudice and national superiority to an end, the Holy Prophet declared in his farewell pilgrimage that "Arabs have no superiority over Non-Arabs." According to Islam, no particular nation has been chosen by God for the bestowal of His favours ; **thus in Islam the unity of human race is strengthened by faith and not by worthless treaties**. The doctrine of One God and Humanity constitutes the muslim faith and Dr. Iqbal reminds us of our duty when he says :

ہوس نے ٹکڑے کر دیا ہے نوع انسان کو
اخوت کا بیان ہو جا محبت کی زبان ہو جا

Faith alone can exalt the position of mankind :

غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمشیریں نہ تدبیریں
جو ہو ذوق یقین پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں

کوئی اندازہ کر سکتا ہے اسکے زور بازو کا
نگاہ مرد مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں
ولایت، پادشاہی، علم اشیا کی جہانگیری
یہ سب کیا ہیں فقط اک نکتہ ایماں کی تفسیریں
تمیز بندہ و آقا فساد آدمیت ہے
حذر اے چیرہ دستاں سخت ہیں فطرت کی تعزیریں
حقیقت ایک ہے ہر شے کی خاکی ہو کہ نوری ہو
لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرہ کا دل چیریں
یقین محکم عمل پیہم محبت فاتح عالم
جہاد زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں
یقین افراد کا سرمایہ تعمیر ملت ہے
یہی قوت ہے جو صورتگر تقدیر ملت ہے

3. War and Jihad.

Since the ancient days efforts are being made by the reformers and religionists to rule out the wars completely but all of them have arrived at the same conclusion that the war is a nessary evil and can not be completely eradicated. Hinduism preached the doctrine of Ahinusa but we see that the staunchet advocate of that doctrine, Lord Krishna, trained Arjun in the art of war and has to plunge in the war of Kaurawas and Pandawas. Christianity taught humanity, "when you are smitten on the right, turn your left cheek" but Lord Christ very soon realised the hollowness of this doctrine and ordained his followers to the other extremes : "But now he that hath a sword let him take it and likewise his scripts and he that hath no sword let him sell his own garments and buy one." After the Great War, efforts were made to rule out wars completely but the futility of the Kellog Pact, the Washington Agreement and the World Disarmament Conference of Geneva, as mentioned above, proved the fact beyond doubt that the attempt for eradicating the evil of war is nothing but a will-o the-wisp.

A TRAGIC STORY

By ZAHIR MOHAMMAD, C. IX A.

I am going to tell you a very interesting story, which I hope you will read to the end. Once there was a student named Robert in America. He took the highest degree of the Yale University and had a meritorious record. He was married to a young maid namedmiss Simson. She was so beautiful that no language can discribe her beauty. When Robert was five and twenty he was appointed as a high official on £ 100 per mensem.

After two years a son was born to them. He was named MacDonald and was admitted into a school. Like his father he was a brilliant student and was medalled a number of times.

A misfortune befell him: his father died; it was an irreparable loss and he found it difficult to prosecute his studies. His mother was highly educated, therefore, she spared no pains in training him. His only consolation, and the chief support, his overloving mother, also left him when he was barely thirteen. He looked after his property and exerted utmost to secure a 1st division in his examinations. One night all his wealth was stolen away. He became very sad. But he decided to face the troubles: he knew life was a probation. Somehow or other he passed his examination and secured good marks. He made up his mind to apply for a job. He made an application to the Vice-Chancellor of the University asking for the post of a Junior Lecturer; but the Vice-Chancellor replied, "No Vacancy" He also tried for other posts, but he could not be provided with a job At last he decided to solve the problem. Life had no meaning to him; he desired an end of his life. One day at 8 p.m. he went near the river St. Lawrence.

Just when he was going to jump, he heard a bell. He stopped and turned to see. He saw a policeman bearing something in his hand. After a minute or two the policeman enquired where Mr. Macdonald lived. He replied that it was he.

The policeman said, "here is a telegram for you." MacDonald at once opened the envelope to see the telegram. The long face was turned into a happy countenance when he saw that he was appointed as a lecturer in the University. Now surely you will say why at first he was told that there was no vacancy and why he got a post later on. One of the lecturers of the University fell ill and died. In his place he was appointed.

He showed his ability there and was promoted to senior readership. His pay was increased to £ 200 per mensem. He was also appointed as a member of the executive committee and an extra allowance of £ 15 was given to him.

One day he saw the key of treasury lying on the floor. He took the key and determined to take some money from the treasury. One night he went and jumped into the treasury and stole about 5,000 Gold coins.

A man is his own star

Our acts our angels are

For good or ill

The matter was disclosed and he was arrested. He was ordered by the magistrate to pay the sum in a week. It was impossible for him to pay such a large sum, because he had spent all the money.

He thought some thing and went to the market. He told the driver of a taxi that he wanted to go to Kingston and would pay him £ 10.

The driver agreed and both of them started.

After continually journeying for four hours they reached Kingston. The driver stopped the car and said "where do you want to go? No reply came. He turned back to see. He found him dead.

"VALUE OF TIME"

By SYED MOHAMMAD WAQIF RIZVI, (EX-STUDENT)

Some people do not know the value of time. They spend their precious moments in idle longings and in building castles in the air. But they should bear in mind that they are treading on a wrong path. They should think that 'time and tide wait for no body.' To put off work for tomorrow is a very bad habit, because "tomorrow" is the devil's motto. The work of such people falls into arrears. 'Take time by the forelock' goes the proverb. We must work according to this proverb and must frame a routine. Don't waste your time and you will achieve your aim. By dint of hard labour you will be able to become a great man in the world. On one occasion Napoleon said, "I succeeded in life because I knew the value of five minutes," and on another occasion he advised some school boys thus, "Boys, every hour wasted at school means a chance of misfortune in after-life." Know the value of time, snatch and seize and enjoy every moment of it. For who knows most, him loss of time most grieves.

We must use time rightly and properly. There is a proverb, "Strike while the iron is hot." We should "make hay while the sun shines," for delay is some times dangerous. But instead of using it properly we waste it. There are hours which are taken from us, some are stolen from us, while some slip from us. This is our own mistake; we must try to remove this defect and must try to be earnest in utilizing the precious moments of time.

"Are you in earnest? Seize this very minute
What you can do, or think you can begin it."

Where there's a will there's a way.

Some men always complain of the lack of time. But they are not justified in doing this. They should bear in mind that want of time is a lame excuse. Time is as elastic as a piece of rubber. We may utilize it as we like.

We must be very punctual in our daily routine. It is very important for business men, for punctuality is the soul of business. If we are not punctual in business our business will be dislocated.

In conclusion, I will write that we must try to utilize every moment of our time, for only by a proper use of time can we achieve glory in our life. It was merely the proper use of time which made innumerable persons famous in the history of the world.

The heights by great men reached and kept,
Were not attained by sudden flight,
But they while their companions slept
Were toiling up-wards in the night.
We must try and try and in the end, we will achieve glory.
We have not wings, we can not soar,
But we have feet to scale and climb,
By slow degress by more and more,
The cloudy summits of our time.

Longfellow.

NECESSARY FOR HEALTH

M. ZULFEQAR ALI SIDDIQI, Class X-A.

1. Take bath daily with cold or fresh water.
2. Clear your teeth daily with a tooth brush.
3. Don't read in bad light or a book of small letters; for this will strain your eyes.
4. Take exercise in the open air.
5. Hard exercise should not be taken just after heavy meals.
6. Sleep at night for at least eight hours.
7. Do not sleep with the face covered, doors and windows closed.
8. The clothes should be light and loose and hang from the shoulder.
9. There should be separate clothes for day and night.
10. All the eatables should be covered and kept in almirahs.
11. Kitchen should not be near a latrine, nor near a sleeping room.
12. The food must be light.
13. We should be up from the bed early in the morning and go to bed early in the night.

Alphabetical Enigma

By SALAHUDDIN A. ANSARI, Ex-student

Husband:—A.B.B.G., I.A., T.P.G.A.

Wife:—T., P K.I.G.

*Tea.

RESPECT

By S. A. ANSARI, Ex-student

Having a strong love for educational qualifications, I started to appear in a test examination, in order to gain admission into the school. I was called for an interview with the principal. When my turn came, I entered the office with an air of familiarity, as though I was an old boy of the school. No sooner had I entered the office, than the Principal asked, "What is your name?"——————"Salahuddin Ansari," was the answer. It did not seem to please him, and he asked me to answer politely to the elders, and added "you should always use the word *Sir*, when you are speaking to an elder. Now, tell me again, "What is your name?"

"Sir Salahuddin Ansari,"

I answered.

Science and Human Progress

By AHMED HABEEB, C. IX-A.

The modern age is the age of Science. Science has produced wonder after wonder and the inventions and discoveries have dazzled people's eyes. By the aid of science, the impossible has been made possible. It has lengthened life and minimised dangers. The science of medicine, has made a wonderful progress and has restored eyes to the blind and added comfort, ease and convenience to man's life. The glorious achievements of science have left the world spell bound. The world and especially the western world has achieved a remarkable progress in the field of scientific research. In spite of all this, science has done much harm. It has its dark side as well. When we think of its benifits, we forget the defects attendant on it. In this age of science which boasts of hundreds of inventions, life is often not so comfortable and easy going as it is thought to be. It has made men worthless and lazy. It is the only cause of unemployment, a problem which is engaging the attention of the world for its solution. The poor are leading miserable lives and have fallen an easy prey to disease, hunger, starvation and what not.

All this destruction and miseries of human life have been caused by the develish inventions of science. Humanity has suffered more from science than has been benefited by it. Thousands of innocent boys and girls have breathed their last in the present Sino-Japanese conflict.

Riddles

1. I am a word, if you will cut my head, I will be on your head, and if you will cut again my head I will spread in the world, tell my name.

2. First of the first is the first of it, last of the last is the last of it, second and third are Zero, tell my name.

3. Twenty-six apples are hanging by, twenty-six soldiers are passing by, each took one how many left.

Answers

1. Chair.

2. Foot.

3. Six, because twenty-six soldiers are passing by.

Kamal Attaturk---Founder of Modern Turkey

By SHOUKAT ALI, EDITOR

"Lives of great men all remind us
We can make our lives sublime
And departing leave behind us
Footprints on the sands of time".
—Longfellow.

Childhood and Early Youth.

Kamal Attaturk, the founder of Modern Turkey, was born in 1881, at Salonica. He comes of a middle class family. His father, Ali Raza, held a government post in the Custom's Department. Ali Raza wanted to give higher and secular education to Kamal, but early death prevented him from doing so. Kamal, after the death of his father, found himself thrown in the world without any resources His mother, Zubeida, a woman of great strength of character, was in no way discouraged by this terrible misfortune. The family was taken care of by a brother of Zubeida, who lived in the country side. Being religious and orthodox, her personal inclination was to make Kamal a doctor of Islamic Law; but she respected the wish of her dead husband and sent Mustapha to a modern school. Here he passed all his examinations with great credit, and very favourably impressed his teachers with his exceptionally keen intelligence. His side occupation was scaring away birds from the wheat fields of his uncle. Here he acquired a sound taste for agricultural pursuits, which he still carries on in his leisure time.

The dull and monotonous country life provided little outlet for super human energies of Kamal. He, however, left the Higher Elementary School, and unbeknown to his mother, decided to join the junior Military College at Salonica. He passed the admission examination and was admitted to the College. His ability immediately attracted the attention of his superiors. One of his teachers was so much impressed by his intelligence and superiority of character that he gave Mustapha an additional name of 'Kamal' or 'Perfection'.

Kamal stood first in the junior College Examination and broke all previous records of proficiency. He was admitted to the Senior Military College. It was here that he developed his literary faculties and studied French literature very deeply.

The Rebel

In 1904, Mustapha graduated from the Military College with the rank of a Captain. His liberal tendencies soon compelled him to join a secret society called 'Vatan', which was founded to overthrow the despotic government of Sultan Abdul Hameed. This brought him into trouble with the central government. The secret Police were on his track. He was arrested and cast into the prison for carrying on revolutionary activities. After a short time, he was granted pardon and posted to Damascus as a subordinate officer. Here he got the opportunity of studying Arab Nationalist movement and came to the conclusion that Arabia was a drain on the slender resources of the crumbling Turkish Empire. Somehow or other, he secured his transfer to the Third Army based at Salonica, his native city.

At Salonica, he founded the famous "Union and Progress Committee", which was to overthrow the despotic regime of Abdul Hameed. Zubeida, when she found him plotting against

the Sultan, rebuked him. Kamal only replied that he was honour bound with brother officers to bring about great political changes.

In due course, thanks to the untiring efforts of Anwer and Kamal, the revolution succeeded and Kamal came to Constantinople at the head of the Third Army. The Sultan's despotism was ended, and a liberal constitution was granted.

Anwer Pasha wanted to drag the army into politics; but Kamal, a soldier to the very core of his heart, urged the absolute necessity of keeping it out of it. He clearly foresaw that such a policy was bound to bring about the military dictatorship and would place the army in the hands of adventurous politicians. Such a scheme of things, Kamal argued, would ever be conducive to the welfare of the country. He however, earnestly demanded for the establishment of a real democracy.

Anwer Pasha was now so much intoxicated with power that he openly ignored the views of Kamal. Mustapha, in his turn, felt disgust for those who had been swept into power *overnight*. Ultimately, Kamal resigned from the Union and Progress Committee, and like Julius Caesar, turned from politics to army in order to satisfy his unlimited ambitions.

The Soldier.

War clouds were already gathering on the horizon. In 1911, the Italians, without any excuse, declared war on Turkey, and invaded Tripoli. The Turkish Empire, once the mightiest naval power in the world, had become so weak that it could send no expeditionary force, by way of the Mediterranean, to defend her African province. Mustapha Kamal, however, eluded the vigilance of British authorities in Egypt and made his way to Tripoli. He organised the local Arabs, took Command of the forces, fought the Italians for about a year and defeated them many times. The Italians, at that time, did not know that the schemes of their defeats originated in the mind of a young Turkish officer, who was soon destined to be ranked with the greatest generals of the world.

The Italo-Turkish war was still dragging on in Africa, when another storm burst over the Ottoman empire. Four Balkan powers-Greece, Bulgaria, Serbia and Montenegro-formed a league to turn the Turks bag and baggage out of Europe. They attacked Turkey without any cause. Turkish armies were surprised and defeated on almost every front. The atrocities committed by the Balkan armies, on Muslim populations of Macedonia, were simply indescribable. Whole families were burnt to death or bayonated. The Muslim quarters of Salonica, the native city of Kamal, were sacked. Mustapha, when he heard the news of these disasters, rushed from Africa to Constantinople. He found his beloved fatherland in a state of utter confusion. Istanbul, "the Eternal Enchantress of the East," was suffering from unparalled gloom and was full of terror-stricken refugees from Macedonia. Cholera and plague were taking heavy toll of human lives. For two days Mustapha searched the refugee camps to find his mother and sister. It was after great difficulty that both were found in an utterly exhausted conditions. Zubeida had become almost blind due to intense grief, which had overwhelmed her after the destruction of her family at the hands of the Greeks. Kamal was, however, given a command in the army and entrusted with the impossible task of checking the sweeping advance of the Balkan armies. Mustapha Commanded his division with exceptional ability and reoccupied many important

positions. But Turkey had so hopelessly lost all the key battles that occasional advantages gained by Kamal, could not change the course of events. After a disastrous war came a disastrous peace. Turkey in Europe was reduced to a small district around Constantinople.

Mustapha openly critisized Anwer Pasha and laid the blame for all disasters at his door. He strongly opposed the appointment of a German Military Mission for the reorganisation of the Turkish forces; because he thought it a folly of first magnitude to entrust the conduct and secrets of the army in the hands of foreigners. He argued that such a policy was the result of cowardice and lack of self-reliance in Turkish Military genius. All his protests, however, remained unheeded.

Anwer Pasha, to remove him from the Capital, promoted him to the rank of a colonel and appointed him as a Military attache at Sofia. He retained this post until the outbreak of the World War.

Life at Sofia was gay. Kamal spent most of his time in dancing and mixing up with high society girls. His most beloved friend was the young and beautiful daughter of the Bulgarian general who had defeated Turkish armies in many an action during the Balkan wars. While Kamal was enjoying life at Sofia, three young Serbians were practising with their pistols at dummy targets in Serajevo. They were to be the murderers of the Heir Apparent of Austria. Their fatal assault on the prince and his wife brought about the World War. Turkey had already committed herself to help Germany. Anwer Pasha ordered the Turkish fleet to bombard the Russian ports on the Black Sea. This was a signal for hostilities. England, Russia and France declared war on Turkey.

Mustapha never appreciated German strategy. He opposed his Country's entry in the war and advocated the policy of watchful waiting. His opinion was that the issue would be fatal to the German cause. Kamal was always fearless and openly criticised the Kaiser's generals. He maintained his strong suspicions about German victory, even when the German armies were almost at the gates of Paris. Still he did his duty. Colonel Mustapha Kamal was entrusted with the command of the third division stationed at Gallipoli, a place that was likely to be attacked by the Allies.

England was preparing to attack this key position with all her might. She had gathered one hundred thousand Australians, New Zealanders, Gurkhas, etc. They were the flower of the British army. Their landing at the Dardanelles was to be supported by the strongest navy in the world. British attack opened on the stratagic points of the Straits with great suddenness and force. It was Kamal's division that bore the brunt of the fighting. Kamal successfully repelled every British attack made upon his sector. At a Critical moment he was given the Command of the entire Turkish forces. His subordinates, when some Turkish Counter attacks failed, become anxious and nervous. Kamal was, however, always calm and replied when requested for help from a certain sector, "Don't be anxious. The situation is not so grave as you think. I shall come to you, and settle everything." He arrived on the scene and drove the British back towards the beaches. On another occassion, he personally led an attack, passed through the heavy rain of steel, burst upon the British trenches, bayoneted 12000 Britons and came back quite safe. His wrist watch, however, was broken when a bullet struck it. The Turkish soldiers, whose stan-

dards of bravery are unequalled in the world, greatly appreciated the super-human courage exhibited by their leader.

One day he jumped out of his trench, sat upon its wall and thus fully exposed himself to British fire. British guns immediately began bombarding Turkish lines. A shell burst at a distance of 30 yards from Kamal. His subordinate officers shouted to him to take cover. He said, "Impossible, I cannot set you a bad example." The second shell came and fell 10 yards nearer than the first. Kamal took a cigarette out of his pocket and lighted it. The third shell arrived and fell only 10 yards away. Kamal went on smoking unconcernedly. There followed a few seconds of breathless silence. The fourth shell might have reduced him to ashes. But the impossible happened. It did not arrive. That British gun had, probably, three shells only. Kamal continued smoking and smiling at his followers, as if, nothing had happened.

The story of the disasters that overtook the English is a long one. The advantage that Kamal gained over them, forms one of the most important feats ever performed by military genius. It was mainly due to the brilliant generalship of Kamal that the Dardanelles were saved, the British and the French were prevented from joining hands with their Russian allies and the great War was prolonged by three years.

The Turkish victories at the Dardanelles made the name of Kamal a household word in all civilized world. But he became a thorn in the side of Anwar, who transferred him to the Caucasian front where the Turkish armies had suffered Crushing defeats at the hands of Russians.

Again, his military genius shone. He retrieved the heavy losses suffered by Anwar Pasha and captured many important towns from Russians. After the Russian defeats, Kamal returned to Constantinople as a victorious general, but he still believed that Germany would lose the war.

By a special appointment Kamal was sent to command the IV army in Palestine. He was constantly at odds with German generals. Realising that his Co-operation with Germans was impossible, he resigned his post and returned to Constantinople.

He was ordered to accompany prince Waheeduddin, the Heir Apparent, to Germany. He toured the Western Front and disconcerted German High Command by making very bold remarks, when asked about his impressions. One of them is quoted below: "Where are your reserves?" "We have none." "Then you are not the victors. Your situation is critical." "You have lost the war," was the blunt answer he gave to Hindenburg and Ludendorff.

On his return to Turkey, he awaited the collapse of Anwar regime. He was, however, called by the Sultan and given the Command of the VII Army in Syria. The end of war was already in view. Turkish armies were in hopeless condition. More than one-half of the Turkish soldiers were suffering from chronic diseases. Food supplies and ammunitions were simply unobtainable. Local populations were hostile to the Turks. Desertions from the army were common. No help could be received from Germany. She was herself hard pressed on the Western Front, on account of the entry of America on the side of Allies. Communications were cut off and railway bridges blown to pieces by Colonel Lawrence and his bedouins. Turkish messengers fell to Arab bullets and daggers. Kamal, when he saw these Conditions, suffered from the first and the only shock of

his life. Moreover, he was attacked by severe kidney pain and confined to bed. He got up, on the eve of British offensive, from his bed to command his army. Avoiding disaster was now beyond human power; but it was unsoldierly to give up all attempts.

The British attack developed with terrific force. Turkish armies were overwhelmed by a tenfold superiority of numbers and equipment. Mustapha Kamal, with great ability, managed to extricate some detachments of his army by a flanking movement. The rest of the Turkish forces were either killed by British and bloodthirsty Arabs or taken prisoners. Kamal, with the remnants of his brave soldiers, fell on Aleppo and formed a new line of defence. Here he was again attacked by Australians and Jodhpur Lancers. Kamal fought them with his back to the wall and defeated them. In an order to his army, he said, "The enemy shall never cross this line." On 30th October, 1918, the Armistice was signed and there began a new, critical and bloody chapter in the history of Turkey.

Rebel Again.

Hopelessness and dejection prevailed at Constantinople. The Country seemed to be entirely at the mercy of the conquerors. Everybody was resigned to fate. Allies' battleships entered the Golden Horn and threateningly directed their guns towards the capital. The behaviour of the Coloured French troops and native Christians was simply unbearable. Turkish nobles and ladies were dragged out of their houses and openly insulted. All Turkey, quivered with anger at these insults; but there was no strength left to teach a lesson to the Allies. All this was only an introduction to an extremely humiliating peace terms to be imposed on Turkey. There was only one man in Turkey who still had faith in the destiny of his Fatherland. Kamal believed that Turkey could only be saved by the force of Turkish bayonets, and not by sentimental appeals to the tender mercies of the Allies.

Fortunately, he was sent to Anatolia as the Inspector General of the army. He began to rally Turkish forces around him to fight the British and Greeks who had occupied Smyrna. He was suspected of carrying on "unlawful activities" and called to the Capital.

He refused to return, sent up his resignation and remained in Anatolia. Kamal Convened a Nationalists Congress at Erzrum and formed a Nationalist Government at Angora for the defence of Turkey.

England then determined to crush the nationalist movement. She persuaded Greece to send an army towards Angora. Kamal checked the Greek advance; but the Greeks refused to accept defeat. England then supplied them with the finest war material and they again resumed their general advance towards Angora. This new advance was stayed after a long drawn battle of three weeks on the banks of river Sakkaria, in Central Anatolia. The Greeks were 150000 strong and were equipped with the latest and most up-to-date weapons of destruction. The Turks were 25000 and were badly lacking in all sorts of war requirements. Their successful resistance, therefore, to Greek attacks was nothing short of a miracle. Extremely determined batches of Turkish soldiers fought for ten or more days without taking any rest or food. It was at Sakkaria that Europe encountered the Turk himself; and the tide of history was turned.

A year of anxious waiting followed the battle of Sakkaria. At last, the hour, for which Kamal had awaited, arrived. He took

the offensive against the Greeks and routed them in two important battles. Within two weeks, the Greek armies of occupation were thrown into the Mediteranean. Great Britain sued for an Armistice. As the result of negotiations Turkey regained her European and Asiatic possessions with the exception of Arab provinces.

The Republic was proclaimed on the 29th October, 1923. Turkey was once more placed on the map of the world and the past humiliations entirely effaced.

The Reformer and Statesman.

Kamal is really the founder of Turkish greatness and prosperity. Like all great men, he has clear vision, deep faith and unlimited capacity for work. He never lost faith in the destiny of his Fatherland and during the tragic period that followed the Great War, he uttered words that will be written in history in bold golden letters : "Our people can never die, but if they should, the crust of the earth would not be solid enough to sustain the weight of their coffins."

It is by analyzing the achievements of Turkish Rupublic during the last 16 years that we can form a true estimate of Kamal as a reformer, builder and statesman. Being gifted with a broad vision, he clearly foresaw that Turkey, to become a modern state, must cut off almost all its connections with the past with the exception of religion in its very broad sense.

His first act to make Turkey a homogeneous state, was to arrange for the exchange of population with neighbouring European countries. It involved great sacrifices and expenditure of money, but he considered nothing too costly, that could make a solid Turkish nation. So far, about 2000000, Turks have been brought from Greece, Bulgaria, Yugo-Slavia, and Rumania and settled in different parts of Turkey ; and about the same number of Christians have been expelled from Turkey.

The social, political, economic, religious, legal and educational reforms introduced by Kamal are too many to be ennumerated here. It is sufficient to say that they have transformed Turkey into a first class modern state, which can easily hold its own against its European neighbours.

Turkish renaissance has got more than regional importance. The liberal and progressive tendencies of Modern Turkey have deeply affected and reacted on the neighbouring Islamic countries and have been an important cause of regeneration in Iran, Syria, Iraq, Trans-Caucasia and Egypt. Sooner or later, the entire Islamic world is bound to be influenced by Turkish Revolution.

Atatturk, the author of this revolution, is one of the greatest and most outstanding personalities of our times. His name will always inspire courage and hope in peoples threatened with destruction and loss of national self-respect. Modern Turkey is a monument to his greatness.